

عرفانستان

حکیم محمد سعید

عرفانستان

حکیم محمد سعید

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس
کراچی

مولف : حکیم محمد سعید

ناشر : ہمدرد فاؤنڈیشن پریس

ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰

طابع : یونیورسل بلاک پرائیویٹ لمیٹڈ،

شاہ راہ لیاقت، کراچی

اشاعت اول : ۱۹۹۲ء

تعداد : دو ہزار

قیمت : سو (۱۰۰) روپے

ترتیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ اوّل

مسعود احمد برکاتی

ہر دور اپنے مسائل اور اپنے تقاضے ساتھ لاتا ہے' بلکہ یوں کہنا صحیح ہے کہ انھی مسائل اور مقتضیات کا نام دور ہوتا ہے۔ اسی لحاظ سے اس دور کی سوچ اور سوچنے کے طریقے بھی اس کے اپنے ہوتے ہیں۔ فکر اور انداز فکر بھی ہر دور کا مختلف ہوتا ہے۔ مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کا زاویہ بھی الگ ہوتا ہے۔ اسی طرح دین کو سمجھنے اور کتاب و سنت کے مطالعے اور تفہیم کی زبان بھی ہر دور کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔ دینی علوم کا مطالعہ شعوری اور غیر شعوری طور پر ہر عہد سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ دین غیر مبدل ہے اور قرآن اور احادیث کے معانی بھی ہمیشہ ایک ہی رہتے ہیں' لیکن ان معانی کے اظہار کی زبان ہر دور کے انسان کی اپنی زبان ہوتی ہے۔

موجودہ دور سخت مقابلے اور مسابقت کا دور ہے اور مقابلے کا ہتھیار علم سے بڑا کون سا ہوسکتا ہے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم علم کی روایت کو اس خوبی سے آگے نہیں بڑھا رہے ہیں جو ہمارے اسلاف کا شیوہ تھی اور جس کی ضرورت اس زمانے میں اور بھی زیادہ شدید ہے۔ دین کے مطالعے کا شوق نئی نسل میں کم و کم تر ہوتا جارہا ہے۔ اس کا سبب ابتدائی تربیت اور ماحول کے علاہ ہمارے نظام تعلیم کی خامی بھی ہے' لیکن ایک اہم وجہ دینی علوم کو نئی زبان میں اور عہد کے تقاضوں کے مطابق پیش کرنے کی کمی بھی ہے۔

محترم جناب حکیم محمد سعید صاحب اپنی گوناگوں مصروفیات' ذمے داریوں اور عظیم منصوبوں کے باوجود نہ صرف مطالعے کے لیے وقت نکالتے ہیں' بلکہ اپنے مطالعے کے نتائج کو آج کی زبان اور تقاضوں کے مطابق پیش کرنے میں بھی مصروف رہتے ہیں۔ حکیم صاحب محترم کی ایک بہت جامع کتاب نورستان کے نام سے شائع ہوچکی ہے' جس

میں انھوں نے دین کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم اور سلیس زبان میں روشنی ڈالی ہے۔ نورستان بہت مقبول ہوئی۔ علما اور دانش وروں سے لے کر عام تعلیم یافتہ لوگوں تک نے اس کو پسند کیا اور دور جدید کے لیے ایک نہایت مناسب کتاب قرار دیا۔ اس کتاب کے کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب بھی حکیم صاحب کی مختلف دینی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ یہ تحریریں مختلف اوقات میں مختلف ضروریات کے تحت لکھی گئی ہیں۔ قرآن حکیم اور احادیثِ نبویؐ کی روشنی میں حکیم صاحب نے مختلف مواقع پر جو گفتگوئیں کیں، ان کو بھی اس مفید مجموعے میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ان منتشر تحریروں کی تلاش اور جمع آوری میں جناب ڈاکٹر سید فرحت حسین صاحب نے بڑی مدد فرمائی۔ ان کا شکریہ واجب ہے۔

کتاب کو عقائد و افکار، انبیاے اولؑ و آخرؐ، صحابۂ کرامؓ، شہادت حسینؓ اور تفضیلاتِ رمضان کے بڑے عنوانات کے تحت تقسیم کردیا گیا ہے۔ اس سے قارئین کرام کو مطالعے اور تلاش مواد میں سہولت ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ قارئین کرام اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف خود دل چسپی سے فرمائیں گے، بلکہ احباب کو بھی اس سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیں گے۔ علم، حکمت اور خیر کی اشاعت ہمارا انفرادی اور اجتماعی فریضہ ہے۔ اگر ہم اپنے وقت کا تھوڑا حصہ دین اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے کے لیے صرف کریں اور اس مطالعے کو اجتماعی صورت دیں تو اس طرح ہم دین کی تفہیم میں آسانی اور پختگی کے فوائد حاصل کرسکیں گے۔

حکمت و ہدایت

جو حکمت و ہدایت اور بصیرت و رہنمائی قرآن میں ملتی ہے وہ چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی انسانیت کی صلاح و فلاح کی ضامن ہے اور قیامت تک رہے گی۔

مطالعۂ قرآن

رمضان کا مقدس مہینہ اپنی اہمیت، صفات، خصائص اور برکات کے اعتبار سے تمام مہینوں پر فضیلت رکھتا ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے کہ جس میں سرور کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم نازل ہوا۔ قرآن کریم کا نزول انسانوں کی ہدایت و رہنمائی اور ان کے لیے ایک لازمۂ زندگی اور ایک ضابطۂ حیات کے طور پر ہوا۔ رمضان المبارک خوش نودی رب اور احتساب کا مہینہ ہے۔ یہ مہینہ ایثار و قربانی، نفس کشی، تعلق باللہ اور تطہیر جسم و روح کا مہینہ ہے۔ اس کی ستائیسویں شب تاریخ ارض کی سب سے بڑی شب اور شب ہائے حیات انسانی کی سب سے زیادہ روشن اور منور شب ہے۔ اس میں نزول قرآن کی ابتدا ہوئی اور قرآن کی روشنی نے صفحۂ ارض کی تمام تاریکیوں کو دور کرکے انسانی بصارت و بصیرت اور فہم و ادراک کے لیے تمام راہیں روشن کردیں۔

قرآن سے پہلے بھی دنیا کی مختلف قوموں اور ملتوں کے لیے کتابوں کا نزول ہوتا رہا، لیکن عالم گیر اور ہمہ گیر حیثیت صرف قرآن ہی کو حاصل ہوئی ہے۔ یہ ایک ضابطۂ اخلاق اور دستور حیات ہے۔ نظام حکومت اور آئین شریعت ہے۔ اس وقت پردۂ دنیا پر سوائے قران پاک کے کوئی بھی کتاب ایسی نہیں جو تحریف سے پاک ہو، جس کی تعلیمات اپنی اصل صورت میں موجود ہوں اور جو نفس و روح کے ہر مرض اور ہر دکھ کا تیر بہ ہدف علاج پیش کرتی ہو۔ قرآن پاک ہی وہ مقدس صحیفہ ہے جو لفظی اور معنوی اعتبار سے ہر قسم کے تغیر سے محفوظ ہے۔ اس کے بارے میں یہ دعوا بالکل صحیح اور درست ہے کہ وہ جن الفاظ کے ساتھ آج سے ۱۴ سو سال پہلے نازل ہوا تھا بعینہٖ انھی الفاظ کے ساتھ آج تک محفوظ ہے۔

قرآن کا نزول انسانیت پر اللہ تبارک و تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان ہے۔ آج ابتدائے نزول قرآن کو پورے چودہ سو سال ہوچکے ہیں۔ اس مدت طویل میں اس کے کسی ایک حرف اور کسی ایک نقطے میں بھی کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اسی طرح ہدایت و رہنمائی کے جو اصول قرآن میں ملتے ہیں وہ چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی انسانیت کی صلاح و فلاح کے ضامن ہیں اور قیامت تک یہ خصوصیت قائم رہے گی۔ آج انجیل مقدس کے ماننے والے بھی موجود ہیں اور توریت و زبور پر اعتقاد رکھنے والے بھی۔ بلاشبہ ان کتابوں کا آسمانی کتاب ہونا ایک حقیقت ہے، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کتابوں میں اس درجہ تحریف ہوگئی کہ ان کے احکام و ہدایات اور اوامر و نواہی اپنے اصل جوہر سے محروم ہوچکے ہیں۔ قرآن کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ حتیٰ کہ قرآن کے بارے میں یہ بات وہ مستشرقین بھی نہیں کہہ سکے جن کا منشائے حیات ہی مخالفت اسلام و قرآن ہے۔۔ قرآن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (الحجر: ۹)

(رہا یہ ذکر، تو اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہ بان ہیں)

ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا دعوا ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتاب اور دنیا کی رہ نمائی کے لیے آخری صحیفہ ہے۔ بنی نوع انسان کی صلاح و فلاح قرآن کے ماننے پر منحصر ہے۔ قرآن کے بارے میں ہمارا یہ دعوا اگر محض منافقانہ نہیں تو اس کا کم از کم تقاضا یہ ہے کہ یہ کتاب ہم کو تمام کتابوں سے زیادہ عزیز ہو اور ہم تمام علوم و فنون کے مقابلے میں اس کے سیکھنے اور سمجھنے کے زیادہ شائق ہوں۔ کسی کتاب کو اللہ کی کتاب ماننا، اس کے ہدایت بخش ہونے پر اصرار کرنا اور پھر بھی ہماری زندگی کا اس کتاب سے بے تعلق ہونا کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کتاب سے تعلق تو ہمیں ویسا ہی ہو جیسا کہ ہم ظاہر کرتے ہیں، لیکن عملاً اس سے ہم اس قدر بے تعلق ہوں کہ یہ کتاب نہ تو ہمارے مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہو نہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں۔ نہ اس کا کوئی گزر ہماری عدالتوں میں ہو نہ دفتروں، گھروں اور بازاروں میں، حتیٰ کہ ہمارے دلوں میں بھی نہیں!

قرآن پاک اس لیے بھی قابل توجہ اور قابل مطالعہ ہے کہ اس کو انسانی معاشرے کی تاریخ میں بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ اس کتاب نے انسانی تاریخ کا وہ عظیم انقلاب برپا کیا جس کی کوئی نظیر نہیں۔ دنیا میں لاتعداد انقلابات آئے مگر دنیا کی آنکھ نے ایسا انقلاب کبھی نہ دیکھا تھا کہ جس کا اصل باعث ایک کتاب اور اس کی تعلیمات رہی ہوں۔ چناں چہ اگر ہم صرف تاریخ میں دل چسپی رکھتے ہیں تب بھی ہمیں انسانی تاریخ کی اس سب سے بڑی اور موثر کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ قرآن صرف پڑھنے (قرآن خوانی) ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ سمجھنے (قرآن فہمی) کے لیے بھی ہے۔

فلسفۂ قرآن

حیات انسانی کے لیے فلسفۂ قرآن کے تحت تین چیزیں نہایت اہم اور بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک اخلاق و نظام اخلاق، دوسرے انسان اور کائنات کا رشتہ اور تیسرے نظم مملکت۔ ان کے لیے قرآن کریم نے واضح اصول مرتب کردیے ہیں جو ہمارے لیے نظریۂ حیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں ان کا الگ الگ جائزہ پیش ہے۔

اخلاق و نظامِ اخلاق

اقوام کی تعمیرو تخریب، عروج و زوال اور ترقی و تنزل میں اخلاق جو بنیادی کردار ادا کرتا ہے اہل علم کو اس کا اندازہ بہ خوبی ہے۔ اسلام نے اخلاق کو بنیادی اہمیت دی ہے اور پورے نظام حیات کو اخلاق کے تابع رکھا ہے، بلکہ اسلام کی بنیاد ہی اخلاق پر ہے:

والسماء وما بنٰها ○ والارض وما طحٰها ○ ونفس وّما سوّٰها ○ فالهمها فجورها و تقوٰها ○ قد افلح من زكّٰها ○ و قد خاب من دسّٰها ○ (الشمس: ۵ تا ۱۰)

(اور آسمان کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے قائم کیا، اور زمین کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے بچھایا، اور نفس انسان کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کردی، یقیناً فلاح پاگیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا)

ان آیات میں یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ اصول اٹل اور برحق ہے کہ جو شخص اپنے نفس کے تزکیے اور تطہیر کے عمل میں کام یاب ہوگا وہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک کام یاب

انسان ہے۔ جو شخص اپنے ضمیر کو کچل دے گا وہ اپنی ہلاکت کا سامان کرنے والا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعوے پر بطور دلیل مظاہر و مشاہد فطرت کی قسم کھائی ہے۔ ان مظاہرِ فطرت میں آسمان اور زمین کی تخلیق اور تعمیر شامل ہے اور اسی طرح یہ بات بھی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ضمیر کو ہر سقم و نقص سے پاک پیدا کیا ہے۔ اس میں نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی صلاحیت ودیعت فرمائی ہے۔ گویا نفس انسانی کی یہ صلاحیت اپنی اہمیت میں آسمان، زمین اور دیگر مظاہر فطرت کے برابر ہے۔ نفس انسانی میں اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے اور خیر و شر کو پہچاننے کی صلاحیت عطا کرنے کے فعل کے لیے قرآن حکیم نے الہام کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس فطری صلاحیت کے ساتھ وہ رہنمائی اور ہدایت بھی شامل ہے جو انبیاے کرامؑ کو وحی کے ذریعے سے دی گئی۔ یہی دونوں امور قرآن حکیم کے فلسفۂ اخلاق کی اساس ہیں۔

کسی قوم کا نظام اخلاق ان اقدار اور ان روایات سے عبارت ہوتا ہے جو اس کے اجتماعی ضمیر میں پیوست ہوتی ہیں اور جن کو مثال اور معیار کے طور پر وہ قوم مانتی ہے۔ یہ نظام اخلاق در حقیقت اس کے نظام حیات کا ایک جزو ہوتا ہے اور نظام حیات ہی سے نظام اخلاق ماخوذ و متاثر ہوتا ہے۔ جو قوم کچھ عقائد اور نظریات کی حامل ہوتی ہے وہ ان عقائد و نظریات ہی کے مطابق اخلاقی اقدار پر ایمان رکھتی ہے۔ انفرادی و اجتماعی اعمال میں نیک و بد کے کچھ معیارات ہوتے ہیں۔ ان کی بنا پر بعض اعمال مستحسن اور پسندیدہ سمجھے جاتے ہیں اور کچھ اعمال معیوب اور غیر پسندیدہ۔ ان معیارات سے قرب اور ان پر عمل پیرا ہونا ہی اس قوم کی عظمت و کامرانی کا راز ہوتا ہے۔ قوم کے فکری قائدین یا دانش وروں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ افراد قوم کو ان معیارات کی یاد دہانی کراتے رہیں اور قوم کو ان سے دور نہ ہونے دیں۔ اس مقصد کے لیے دانش وروں کو بار بار اور مختلف انداز میں ان اقدار کی عظمت کا اعادہ کرنا اور اس بات کا جائزہ لینا پڑتا ہے کہ اخلاقی اقدار کو کہاں تک پیش نظر رکھا جارہا ہے اور کہاں تک فراموش کیا جارہا ہے۔ نیز فراموش کرنے یا ان سے غفلت برتنے کے اسباب و محرکات کیا ہیں؟

ہم مسلمان کی حیثیت سے قرآن حکیم کو سرچشمۂ ہدایت مانتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن حکیم نے زندگی کے دوسرے تمام شعبوں کی طرح اخلاق کا بھی ایک واضح اور

جامع نظام عطا کیا ہے۔

یہ یقین ہم پر کچھ ذمے داریاں عائد کرتا ہے۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم قرآن کے عطا کردہ نظام اخلاق کو ہر حالت میں بلند و برتر رکھیں اور ہماری قوم کے اصحاب دانش اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتے رہیں۔

انسان اور کائنات کا رشتہ

آج دنیا مادی اعتبار سے عروج و ترقی کی بلندیوں کو چھو رہی ہے۔ سائنس کی پیش رفت نے انسان کو ناقابل یقین سہولتوں اور آسائشوں سے مالا مال کردیا۔ صنعت کی وسعت اور ترقی نے سائنسی ایجادات کو عام اور سہل الحصول بنادیا۔ آمد و رفت اور رسل و رسائل کی ترقی نے زمین کی طنابیں کھینچ دیں۔ انسان خود بھی گھنٹوں میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ سکتا ہے۔ وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے بھی معلومات حاصل کرسکتا ہے اور اپنی اطلاعات و معلومات دور دراز اقوام عالم تک پہنچا بھی سکتا ہے اور ہاتھ پیر ہلائے بغیر صرف بٹن دبا کر بہت سے کام نکال سکتا ہے۔ غرض آسانیوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ایسی آسانیاں اس سے پہلے انسان کو کبھی میسر نہیں تھیں۔ اس کے باوجود انسان خوش اور مطمئن نہیں۔ وہ سکون سے بے بہرہ' بے چین و مضطرب ہے اور راحت اس کے لیے عنقا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ انسان اپنی حیثیت کو بھول گیا۔ کائنات میں اس کا جو مقام ہے اس کو اس نے فراموش کردیا۔ علم کی وسعت اور سائنس کی ترقی اس کی روحانی تسکین نہیں کرتی بلکہ سہولتوں نے اس کو پریشان کردیا۔ آسانیوں نے اس کی صحت کو گھن لگادیا اور اس کے جسم کو بے کار اور بے مصرف بنادیا۔ قدرت نے انسان کا جسم محنت' مشقت اور سعی و جہد کے لیے بنایا ہے' لیکن مشینوں نے اس کو محنت کے قابل نہ رکھا' اس کے اعضا کو سست کردیا اور اس کی صحت چھین لی۔ ایک طرف یہ حیرت انگیز ترقیاں اور دوسری طرف یہ مجبوریاں! ان کی وجہ توازن کی کمی' روحانی ترقی سے محرومی اور کائنات کے نظام میں اپنے مقام کا صحیح تعین نہ کرنا ہے۔ عدم توازن یہ ہے کہ کبھی انسان اپنے آپ کو حقیر' بے چارہ اور پیدائشی گناہ گار تصور کرتا ہے اور کبھی خود کو مطلق العنان اور بالکل آزاد۔ قرآن نے انسان کو صحیح راستہ بتایا ہے۔ قرآن حکیم ہی وہ کتاب ہے جس نے انسان کے متعلق ایک واضح تصور

دیا۔ قرآن انسان کو ایک تہذیب یافتہ حیوان نہیں کہتا بلکہ وہ اس کو ایک مستقل اور آزاد وجود بتاتا ہے۔ اس کو ضروری حد تک آزادی دی گئی اور عقل عطا کی گئی ہے تاکہ وہ آزادی اور عقل سے اس کائنات میں اپنے مقام کو سمجھ سکے اور اس دنیا میں نیک و بد کی تمیز کے ساتھ زندگی گزار سکے۔ قرآن انسان کو خالق کائنات کا نائب کہتا ہے۔ نیابت ایک طرف تو اس کی عظمت ظاہر کرتی ہے اور دوسری طرف اس کی محدود آزادی اور اللہ کو جواب دہی بھی واضح کرتی ہے۔ قرآن کی رو سے کائنات میں انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کائنات کی تمام چیزیں اس کے لیے مسخر کردی گئی ہیں تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھائے اور لطف اندوز ہو۔

نظمِ مملکت

قرآن حکیم انسانی زندگی کے لیے ایک جامع اور مکمل کتاب ہدایت ہے۔ اس کا مقصد انسان کی فلاح اور اس کی زندگی کی اصلاح ہے۔ وہ زندگی کے ایک سادہ سیدھے اور فطری نظام کی طرف انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ حیات انسانی کے تمام پہلوؤں اور مختلف شعبوں کے لیے رہنما اصول بیان کرتا ہے۔ ان سے رو گردانی نوع انسانی کو نکبت و ناکامی کے غار میں دھکیل دیتی ہے اور ان کی پابندی انسان کو امن و راحت، سکون و اطمینان، فلاح و سعادت اور ترقی و خوش حالی عطا کرتی ہے۔
قرآن حکیم کی یہ رہنمائی نہایت حکیمانہ اور اساسی ہے۔ جزئیات و تفصیلات میں قرآنِ حکیم سکوت اختیار کرتا ہے اور انسان کو قرآنی اساس کی روشنی میں حالات و ضروریات کے مطابق خود تفصیلات طے کرنے کا اختیار دیتا ہے۔ زندگی کے مختلف گوشوں کو ایمان و اخلاق کی روشنی سے منور کرکے انسانی عقل و بصیرت کو موقع دیتا ہے کہ وہ اس روشنی کو پھیلائے اور عصری تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھائے۔
انفرادی زندگی کی طرح اجتماعی نظام کے لیے بھی ہدایات دے کر اس کو اخلاقی بنیادوں کا پابند بنادیا گیا اور کسی ایسی چیز کی اجازت نہیں دی جس سے فتنہ و فساد اور انتشار یا نزاع کو راہ ملے۔ قرآن کی روشنی میں مسلمانوں کے حاکم کو اہل ترین اور سب سے زیادہ متقی ہونا چاہیے، چاہے وہ صدر کہلائے، امیر کہلائے، وزیراعظم پکارا جائے یا کچھ

اور۔ حکمرانی کی بنیاد مشورت پر ہو اور حاکم اللہ کے نائب کی حیثیت سے اللہ کے بندوں کے سامنے جواب دہ اور ان کے مفاد کا نگراں ہو۔ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف سے حکومت کرے اور ان کے معاملات کو بے غرضی سے طے کرے۔

قرآنی تعلیمات پر عمل کرنے سے جو معاشرہ وجود میں آتا ہے اس میں راعی اور رعایا دونوں اپنے اپنے افعال کے ذمے دار اور جواب دہ ہوتے ہیں۔ حکمراں کی ذمے داریاں زیادہ ہوتی ہیں اور اس کے اختیارات کی وسعت اس کے فرائض کو بھی وسیع کردیتی ہے۔

قرآن کی روشنی میں نظام مملکت اس طرح مرتب کیا جانا چاہیے کہ وہ **امر بالمعروف** اور **نہی عن المنکر** یعنی نیکی کا حکم دینے اور بدی سے روکنے کا فریضہ انجام دے سکے۔ لوگوں کے لیے نیکی اور سچائی کا راستہ اختیار کرنا آسان ہوجائے اور برائی کو اپنانا دشوار طلب ہو۔

تقویٰ، عدل اور مشاورت پر جو نظم مملکت قائم ہوگا وہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے چاہے صدارتی کہلائے یا پارلیمانی، وہ اللہ کے بندوں کے لیے رحمت ہوگا۔

قرآن کا معاشرتی نظام

کسی معاشرے کی خصوصاً ایک مستحکم اور متوازن معاشرے کی بنیاد دو چیزوں پر ہوتی ہے' ایک حسن عقیدہ اور دوسرے حسن عمل۔ عقیدہ وہ قوت جامعہ ہے جو مختلف افراد' مختلف گروہوں اور طبقوں کو باہم ملاتی' متحد اور مربوط کرتی اور ان میں یگانگت اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ افراد کے بے ترتیب مجموعے کو جو چیز مرتب و مربوط کرکے ایک معاشرے میں ڈھالتی ہے وہ عقیدے کا مشترک ہونا ہے۔ عقیدے کے بعد کسی معاشرے کو منظم اور مضبوط کرنے کے لیے حسن عمل ضروری ہے۔ عقیدے کے مطابق اگر عمل نہ ہو تو معاشرے کا ڈھانچا ہلنے لگتا ہے اور اس کی بنیادوں میں کم زوری آجاتی ہے۔ قرآن جو معاشرہ ہمیں دیتا ہے اس کی بنیاد ایک اللہ' ایک کتاب اور ایک رسولؐ پر ایمان محکم سے استوار ہوتی ہے۔ جو لوگ اس ایمان سے سرشار ہوتے ہیں وہ ایک سلک میں پروئے ہوئے موتیوں کی طرح ایک دل اور ایک جان ہوجاتے ہیں اور انھی سے مسلم معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ سورۂ حجرات میں ہے:

انما المومنون اخوۃ (الحجرات : ۱۰)

(مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں)

اس بھائی چارے کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ سورۂ نساء میں فرمایا گیا:

یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ (النساء : ۱)

(لوگو' اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا)

قرآن اور شارح قرآنؐ نے معاشرے کے استحکام اور فلاح کے لیے وہ تمام بنیادیں فراہم کردی ہیں جن کو اگر ملحوظ رکھا جائے اور ان پر عمل کیا جائے تو ایک نہایت صاف

ستھری، متوازن، خوش حال، پر سکون، پرامن اور ترقی یافتہ سوسائٹی وجود میں آجائے۔ اس کے افراد نہ صرف امن و راحت کی زندگی بسر کریں بلکہ اتحاد و تعاون اور خلوص و محبت کی وہ فضا چھا جائے جس میں فلاح و بہبود اور ترقی و خوش حالی کے لامحدود امکانات ہوتے ہیں۔

قرآن نے معاشرتی نظام کی تعمیر کے لیے جو ہدایات ہمیں دیں اور شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جو نمونہ اپنی پاک زندگی کے ذریعے سے ہمیں دیا اس میں ان تمام مضمرات کی بیخ کنی کردی گئی جو افراد معاشرہ کے باہمی تعلقات کو مجروح کرتے ہیں اور جن کے نتیجے میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں ان حسنات کی تعلیم بھی دی گئی جن کے نتیجے میں محبت و مروت، شفقت، شرافت، خیرخواہی، ہمدردی، رحم دلی، حسن ظن، درد مندی، تعاون، اعتماد، اطمینان، احترام اور انصاف کی صفات و اقدار نشو نما پاتی ہیں اور سکۂ رائج الوقت کی طرح معاشرے کی رگ رگ میں جاری و ساری رہتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اقدار و صفات کی موجودگی کسی بھی معاشرے کی رفعت و عظمت کی مظہر ہوتی ہے۔ ایسے معاشرے میں بے اطمینانی، بے اعتمادی، فریب، دغا، ظلم، لوٹ کھسوٹ، استحصال، ناانصافی، ناہمواری، عدم مساوات، بے تعلقی، لاقانونیت اور بے چینی راہ نہیں پاسکتی۔ ایسا معاشرہ باہمی تعلقات کی خوش گواری کی اعلا ترین مثال ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "اپنے بھائی کے لیے مسکرادینا بھی صدقہ ہے" معاشرتی نفسیات کا وہ زریں اصول ہے جس کی کوئی مثال کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ارشادات نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ انمول ہیرا بھی دیکھ لیجیے اور اس نبی امیؐ کے امتی ہونے پر فخر کیجیے۔ فرماتے ہیں:

> "کیا میں تم کو بتاؤں وہ چیز جو روزے، نماز اور صدقے سے بھی افضل و برتر ہے؟" صحابہؓ نے عرض کیا کہ "ضرور ارشاد ہو۔" فرمایا کہ "آپس کے تعلقات کو ٹھیک کرنا۔"

یہ وہ زریں اصول ہے جو معاشرے کو مستحکم اور مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔ چناں چہ عقائد کا اشتراک اور باہمی تعلقات میں ہم آہنگی اسلام کے معاشرتی نظام کی دو بنیادی چیزیں ہیں جو حسن عقیدہ اور حسن عمل کا جزو لاینفک ہیں۔

قرآن حکیم کے دیے ہوئے نظام معاشرت کے یہ وہ اصول ہیں جو افراد معاشرہ کو متحد و منظم رکھتے ہیں' ان کے دکھ درد کا مداوا کرتے ہیں اور ان کے حقوق کو پائمال ہونے سے بچاتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں کوئی فرد خود کو محروم و مجبور نہیں سمجھتا اور ہر شخص معاشرتی فرائض کی انجام دہی میں برابر کا شریک اور اس کے ثمرات میں برابر کا حصے دار ہوتا ہے۔

عقائد و افکار

۱

انسان اس دنیا میں اپنے عقائد و افکار اور اقوال و اعمال کی شکل میں جو کچھ بوتا ہے' وہی پکی ہوئی فصل حاصل حیات کے طور پر اسے اگلی دنیا میں ملے گی۔

توحید۔ اساسِ دین

اسلام ہمارا دین ہے۔ اس کا ایک نظام ہے۔ اس نظام کی بنیاد اور اساس توحید ہے، یعنی اللہ کو ایک اور واحد ماننا اور تسلیم کرنا۔ دین اسلام کا سارا نظام توحید سے روشن ہے۔ نظام دین میں توحید کو وہی جگہ اور مقام حاصل ہے کہ جو جسم انسانی میں دل کو۔ ہم اس حقیقت سے بہ خوبی آگاہ اور آشنا ہیں کہ اگر دل بیمار اور ضعیف ہوجائے تو انسانی جسم بھی بیمار و بے کار ہوجاتا ہے۔ اگر دل صحت مند اور اچھا ہے تو انسان کا جسم بھی صحت مند اور تن درست ہوگا۔ اگر یہ بات آپ کی سمجھ میں آجاتی ہے تو آپ کو بڑی آسانی کے ساتھ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دین کے نظام سے توحید کو اگر الگ کردیا جائے تو پھر یہ نظام ہی باقی نہیں رہے گا۔

ہر چند کہ دین کی عمارت تین چیزوں پر قائم ہے : توحید، رسالت اور معاد، لیکن واقعہ یہ ہے کہ رسالت اور معاد دونوں توحید کے تابع ہیں اور اسی کے تحت آتے ہیں۔ رسالت کا جزو توحید ہونا یوں ثابت ہے کہ اللہ ہی کو شارع اور قانون ساز ماننا توحید کے مقتضیات میں سے ہے۔ یعنی توحید کا یہ تقاضا ہے کہ ہم اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو شارع اور قانون ساز تسلیم کریں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے احکام و قوانین اپنے رسولؐ کے ذریعے سے بھیجتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اور زندگی کے ہر شعبے میں واجب الاطاعت ماننا اور تسلیم کرنا توحید کا جزو لاینفک ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کو ایک کہتا اور واحد تسلیم کرتا ہے، لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی پیروی سے منحرف ہے وہ قطعی مشرک ہے۔ اس کو توحید سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔ جب ہم نے اس انداز سے حقیقت کو تسلیم کرلیا تو یہ بات واضح ہوگئی کہ رسالت تابع توحید ہے۔

یہی حال معاد کا ہے۔ وہ بھی مختلف پہلوؤں سے توحید کے تحت ہے اور معاد کی ساری روح توحید ہے۔ آپ نے دیکھا اور پڑھا ہے کہ قرآن کریم میں توحید اور معاد کا بیان اکثر ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام اور دین کا سارا نظام توحید سے مربوط ہے۔ اگر دین کو ایک جسم تسلیم کرلیا جائے تو اس جسم کی روح توحید ہے۔ اگر دین کو آنکھ کہا جائے تو اس کا نقطۂ بصارت توحید ہے۔

سارے انبیاے کرامؑ نے ہمیشہ اور ہر حال میں اپنی دعوت کا آغاز توحید سے کیا۔ دعوت توحید کی مخالفت ہر دور میں ہوئی۔ شدید سے شدید مخالفتوں نے سر اٹھایا، مگر اللہ کے ان عظیم و جلیل بندوں نے ان مخالفتوں کی ذرہ برابر پروا نہ کی اور عظیم سے عظیم تر قربانیاں دے کر بنی نوع انسان کے لیے ایک سیدھا راستہ متعین کردیا۔ یہ صراط مستقیم توحید سے عبارت ہے۔

ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ سب سے بڑا حق اللہ کے حق کا اقرار ہے۔ توحید اللہ کے حق کا اقرار ہے۔ سارے حق و انصاف اور عدل و قسط کی یہی بنیاد ہے۔ جو انسان اس حق کو نہیں پہچانتا وہ کسی کے حق کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے نفس کے حق کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ انسان جب اس فہم و ادراک سے محروم ہوجاتا ہے تو انصاف سے دور اور ظلم و تعدی سے قریب ہوجاتا ہے۔ موجودہ زمانے کے ظالم اور ناشکرگزار انسانوں سے جو ناانصافیاں اور جو ظلم ظہور میں آرہا ہے وہ اسی صورت حال کی مثال ہے۔

توحید عقیدۂ مسلم کی بنیاد ہے۔ یہی دین کی اساس ہے۔ اسی مقام سے دین کا پہلا قدم اٹھتا ہے اور اسی مقام پر اس کا آخری قدم پڑتا ہے۔ یہ دین کا دائرہ ہے اور دین اسی وقت تک محفوظ ہے جب تک وہ اس دائرے کے اندر رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ توحید دین کا صرف ایک جزو یا ایک ثلث نہیں، بلکہ سارے دین کو محیط ہے۔ توحید سے باہر دین کا کوئی تصور نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سارے انبیاؑ اس نکتے اور نقطے سے اپنا کام شروع کرتے ہیں اور اسی مقام پر ختم کرتے ہیں۔ یہی راز ہے کہ قرآن مجید و فرقان حمید توحید سے شروع ہوتا ہے اور توحید پر ختم ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی پہلی سورت سورۂ فاتحہ ہے جس کی اصل روح اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری اور کامل تفویض و تسلیم ہے :

الحمد للہ رب العٰلمین○ الرحمٰن الرحیم○ مٰلک یوم الدین○ ایاک نعبد و ایاک نستعین○ اھدنا الصراط المستقیم○ صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین○

(سورۃ الفاتحہ)

(تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے' نہایت مہربان اور رحم فرمانے والا ہے' روز جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا' ان لوگوں کا راستہ جن پر تونے انعام فرمایا' جو معتوب نہیں ہوئے' جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں)

قرآن مجید کے آخر میں سورۂ نصر میں فتح مکہ کی بشارت اور سورۂ لہب میں باطل کی شکست کی پیش گوئی کے بعد سورۂ اخلاص رکھی گئی ہے جو خالصاً توحید کی سورت ہے :

قل ھو اللہ احد○ اللہ الصمد○ لم یلد و لم یولد○ ولم یکن لہ کفوا احد○

(کہو' وہ اللہ ہے' یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہم سر نہیں ہے)

یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ دین کا مرکزی نقطہ توحید ہے اور اب دین اپنے مرکز پر پہنچ گیا ہے۔ اس کے بعد معوذتین ہیں :

قل اعوذ برب الفلق ○ من شر ما خلق ○ و من شر غاسق اذا وقب ○ و من شر النفّٰثٰت فی العقد ○ و من شر حاسد اذا حسد ○ (سورۃ الفلق)

(کہو' میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی' ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے' اور رات کی تاریکی کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے' اور گرہوں پر پھونکنے والوں (یا والیوں) کے شر سے' اور حاسد کے شر سے جب کہ وہ حسد کرے)

قل اعوذ برب الناس ○ ملک الناس ○ اللہ الناس ○ من شر الوسواس الخناس ○ الذی یوسوس فی صدور الناس ○ من الجنۃ والناس ○ (سورۃ الناس)

(کہو' میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب' انسانوں کے بادشاہ' انسانوں کے حقیقی معبود کی اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے' جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے)

یہ دونوں سورتیں شیطان کی آفتوں سے اس خزانۂ توحید کی حفاظت کرتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ شیطان کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ انسان کو توحید کے نقطے سے ہٹادے اور اس کو شرک میں مبتلا کردے۔ اللہ کے بندوں کو دوسرے بندوں کی بندگی میں مبتلا کردے۔ انسان جب اس مرکز سے ہٹ جاتا ہے اور توحید و دین سے راہ فرار اختیار کرتا ہے تو وہ دنیا کی ہر معمولی طاقت کے سامنے سرنگوں ہوجاتا ہے۔ جو انسان اللہ کا بندہ ہوتا ہے اور توحید اس کا عقیدہ اور دین اس کا مدعا ہوتا ہے وہ دنیا کی ہر طاقت کا باغی اور صرف اللہ کا وفادار ہوتا ہے۔ وہ اللہ ہی کو خالق دو جہاں مانتا ہے۔ وہ صرف اسی کی اطاعت کرتا ہے۔ وہ اللہ ہی پر اعتماد کرتا ہے اور صرف اللہ ہی سے مدد کا طالب ہوتا ہے۔

تسلیم و رضا کی معراج یہ ہے کہ انسان خود کو بالکلیہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کردے۔ کوئی مشکل اور مصیبت آئے تو اللہ ہی سے رجوع کرے۔ ہر حال میں انسان کی نظر اللہ کی طرف ہو۔ انسان کی پسند اللہ کی پسند کے تحت ہو۔ اس کی محبت اللہ کی محبت کے تابع ہو۔ اللہ کی ذات و صفات اور حقوق میں اس کی یکتائی کو تسلیم کرے اور کسی پہلو یا کسی انداز سے ان امور میں کسی کو شریک نہ ٹھیرائے' نہ کسی فرشتے کو' نہ کسی جن کو' نہ کسی نبیؑ کو' نہ کسی ولی کو' نہ کسی قائد کو اور نہ اپنی ذات کو۔ صرف قرآن کے بتائے ہوئے احکامات پر عمل کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

و ان ھٰذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ (الانعام : ۱۵۳)

(نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے' تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹاکر تمھیں پراگندہ کردیں گے)

ہم نے وعدہ اور عہد کیا تھا کہ ہم پاکستان میں اللہ کی حکومت قائم کریں گے۔ اللہ تعالٰی نے پاکستان بنادیا۔ اب ذرا غور کیجیے کہ اس پاکستان میں ہم نے کون سا قانون نافذ کیا ہے؟

ہمیں سمجھ لینا اور یقین کرلینا چاہیے اور ہمیں اس کو قول فیصل قرار دے لینا چاہیے کہ اگر ہم وعدہ خلافی کریں گے تو ہم ضرور اپنے مرکز سے دور ہوجائیں گے۔ یہ لامرکزیت ہمیں کبھی سربلند اور سرفراز نہیں ہونے دے گی۔

توحید کا مقام

انسان کو اس کرۂ ارض پر زندگی کے مراحل طے کرتے ہوئے ہزاروں لاکھوں سال گزر گئے۔ اس دوران اس کی تہذیب و تمدن پر تغیر و تبدل کے کئی رنگ آئے اور مٹ گئے۔ کبھی اسے سر چھپانے کے لیے غار بھی مشکل سے میسر آتے تھے۔ تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا نہ تھا اور وہ پیٹ بھرنے کے لیے درختوں کے پتے اور جڑیں استعمال کرتا تھا۔ آج اس کی مدنی سہولتوں کا حسن، ان کی رنگینی اور تنوع دیکھیے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ کیا یہ وہ مخلوق ہے جو ایک ہول ناک بے سروسامانی سے دوچار تھی!

تغیر و ترقی کے اس طویل سفر میں اسے ایک نہ بدلنے والی بات کی طرف بھی بلایا جاتا رہا۔ وہ بات پہاڑوں سے زیادہ محکم، ارض و سما سے زیادہ پرانی اور سورج سے زیادہ روشن تھی۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوا کہ انسان نے اس کے سننے سے جی چرایا، اسے سمجھنے میں ٹھوکر کھائی اور اسے ماننے میں بھی انکار کی راہیں ڈھونڈیں۔

زمان و مکاں کی تمام اختلافی حدوں کے باوجود ہدایت و نور کے وہ پیکر ان عظیم، جنھیں صرف اس بات ہی کی تبلیغ کی غرض سے بھیجا گیا تھا، وہ انسان کو نہ صرف اسی ایک بات کی طرف بلاتے رہے، بلکہ انھوں نے اپنی دعوت کا آغاز ہمیشہ اسی ایک بات سے کیا۔ وہ بات یہ ہے کہ : اے لوگو! اللہ کو مانو، وہی تمھارا پروردگار ہے، وہی کون و مکاں کا خالق و مالک ہے، موت و حیات، نفع و نقصان، مرض و شفا، خوش حالی و تنگ دستی اور عزت و ذلت سب اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ وہ اپنی ذات و صفات میں یکہ و تنہا ہے، وہ ہر احتیاج سے پاک ہے، لیکن تمام مخلوق صرف اسی کی محتاج ہے، اس کی رحمت بے پایاں ہے، اس نے موسم کی تغیر پذیری اور سلسلۂ روز و شب کی حکمت سے

انسان کے لیے یہاں پھلوں' سبزیوں اور دیگر سامان رزق کی فراہمی کا اہتمام کیا اور اس کی زندگی کو حادثوں سے بچا کر صراط مستقیم کی سلامت روی سے سرفراز کرنے کے لیے کتب آسمانی اور انبیا علیہم السلام کا سلسلہ قائم کیا۔

توحید کا یہ نکتہ جس طرح وجود کائنات کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح یہ انسان کی ساری زندگی کا محور بھی ہے۔ اللہ کے تمام پیغمبروںؑ نے ہمیشہ اسی ایک بات کو بار بار دہرایا اور اپنے قول و فعل سے بہ بانگ دہل یہ اعلان کیا :

قل ان صلاتی و نسکی و محیایٰ و مماتی للہ رب العالمین

(الانعام : ۱۶۲)

(کہو میری نماز' میرے تمام مراسم عبودیت' میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے)

اسی دعوت کو آپ ایک وسیع تر بیان میں دیکھیے جہاں ختم المرسلین محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے۔ آغاز کلام توحید سے کرکے معاشرے کے مختلف مظاہر کو اس کے ساتھ اس طرح منسلک کیا گیا ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ توحید ان تمام افعال کی قوت متحرکہ ہے :

قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم الا تشرکوا بہ شیئا و بالوالدین احسانا و لا تقتلوا اولادکم من املاق نحن نرزقکم و ایاھم ولا تقربوا الفواحش ما ظھر منھا وما بطن ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق ذٰلکم وصٰکم بہ لعلکم تعقلون○ ولا تقربوا مال الیتیم الا بالتی ھی احسن حتّٰی یبلغ اشدہ و اوفوا الکیل والمیزان بالقسط لا نکلف نفسا الا وسعھا واذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربیٰ و بعھد اللہ اوفوا ذٰلکم وصٰکم بہ لعلکم تذکرون○ وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ ذٰلکم وصٰکم بہ لعلکم تتقون○

(الانعام : ۱۵۱ تا ۱۵۳)

(اے نبیؐ' ان سے کہو کہ آؤ میں تمھیں سناؤں تمھارے رب نے تم پر

کیا پابندیاں عائد کی ہیں : یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو' اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو' ہم تمھیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے' اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ' خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی' اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھیرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔ یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمھیں کی ہے' شاید کہ تم سمجھ سے کام لو۔ اور یہ کہ مال یتیم کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو' یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے۔ اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو۔ ہم ہر شخص پر ذمے داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے۔ اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتے دار ہی کا کیوں نہ ہو۔ اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمھیں کی ہے شاید کہ تم نصیحت قبول کرو۔ نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس کے راستے سے ہٹاکر تمھیں پراگندہ کردیں گے۔ یہ ہے وہ ہدایت جو تمھارے رب نے تمھیں کی ہے شاید کہ تم کج روی سے بچو)

غور کیجیے کہ وجود باری کو ماننے اور تنہا اسی کو کائنات کا خالق و حاکم قرار دینے کی حکمت کیا ہے؟ کیا یہ کافی نہ تھا کہ اسے صرف اس حد تک خراج عقیدت و عبدیت پیش کردیا جاتا کہ تخلیق کائنات میں اس کا کوئی شریک نہیں' عالم فطرت میں سارا اختیار اسی کا ہے اور اس لحاظ سے اس کی پرستش کرلی جاتی؟ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ اللہ کے سارے اختیارات تو بلا شرکت غیرے تسلیم کرلیے جاتے اور انسان اپنی ذاتی زندگی میں اپنی جبین نیاز اسی ایک کے سامنے جھکاتا' لیکن معاشی' معاشرتی' اخلاقی' سیاسی اور اجتماعی زندگی میں وہ اپنی آزاد مرضی کے مطابق کار و بار جہاں انجام دیتا؟

سوالات کا یہ سلسلہ وہ ہے جو انسان نے یا تو ایک عجیب طرز تغافل کے تحت خاموشی سے پس پشت ڈال دیا یا غیر معقول' پامال اور بے سروپا دلائل کا سہارا لے کر

اپنے موقف کی درستی کا جواز ڈھونڈ لیا۔ کبھی یہ کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ تو ایک بلند و بالا ہستی ہے' اسے انسان کی روز مرہ زندگی کی پستیوں' غرابتوں اور خواہشات کام و دہن کی حیرت ناکیوں سے کوئی دل چسپی نہیں۔ کبھی یہ عذر تراشا گیا کہ اللہ تو یقیناً بہت بڑا ہے' لیکن اس نے اپنے مختلف اختیارات فیض نیابت کے نتیجے میں اپنی چیدہ مخلوق کو بانٹ رکھے ہیں۔ چناں چہ اختیارات کی تقسیم کے تقاضوں کو دیو مالائی اوہام کی شکل دی گئی۔ دنیا کے چپے چپے پر من گھڑت خداؤں اور دیوی دیوتاؤں کے ایک جم غفیر کی پرستش کی جانے لگی۔ کبھی یہ دلیل پیش کی گئی کہ مذہب تو فرد کا ایک نجی معاملہ ہے کیوں کہ اس کا تعلق اس کی روح سے ہے اور روح کی اپنے رب سے مناجات خاموش خلوتوں اور آلتی پالتی مار یوگا کے گیان دھیان ہی میں ممکن ہے۔ پبلک میں اس کا اظہار اس روح کی مقدس عظمتوں کے منافی ہے۔

عقل عیار کی یہ حیلہ سازیاں صرف اس لیے ہیں تاکہ عقیدۂ توحید کو سبوتاژ کیا جاسکے اور ان بامقصد پابندیوں سے کھلی چھٹی مل جائے جو توحید کے تحت انسانی فکر و عمل کو منضبط کرکے عروج و کمال کی راہوں پر چلاتی ہیں۔ ستم یہ ہے کہ تن آسانیوں اور لذت کوشیوں کے دل دادگان توحید کے عرفان و قبول کو غرض مندی کی بھینٹ چڑھا کر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس طرح انھوں نے خود کو ایک استحصال سے بچالیا۔ حال آں کہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح انھوں نے ظلم عظیم کا ارتکاب کیا اور فساد فی الارض کا دروازہ کھول دیا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے :

و من لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکٰفرون (المائدہ : ۴۴)

(اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں)

اس سورت کی اگلی آیتوں میں اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والوں کو ظالم اور فاسق بھی کہا گیا ہے۔

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو توحید اختیار کرنے اور اس پر کاربند رہنے کی تلقین بڑی وضاحت سے کی۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم میں یہ الفاظ موجود ہیں :

یٰبنی لا تشرک باللہ ان الشرک لظلم عظیم (لقمٰن : ۱۳)

(بیٹا' اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا' حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے)

اس سے یہ نکتہ واضح ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر اعتبار سے یکتا و یگانہ مان کر اس کی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کرنا عدل و انصاف کا بنیادی تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کبریائی بے حد و حساب ہے۔ اس کی معرفت و قبولیت کا حق ادا کرنے کی صحیح صورت صرف یہ ہے کہ اس کے اوصاف ہمارے اخلاق و کردار' ہماری معیشت و معاشرت اور ہماری سیاست و تہذیب کی رہنمائی کریں۔

توحید کا تعلق اوہام سے نہیں۔ اس کا رشتہ حقائق سے ہے بلکہ صحیح تر بات یہ ہے کہ حقیقت کبریٰ وہی ہے۔ اس سے ہٹ کر جو راہ نکلتی ہے وہ کفرو فسق اور شرک و ظلم کی پگڈنڈی تو ہوگی مگر حق کی صراط مستقیم نہیں ہوسکتی۔

کائنات میں خیر و شر کیا ہیں؟ ان کے مظاہر کیا ہیں؟ انسان کے نفس اور اس کے معاشرے میں ان کی عملی شکلیں کس طرح اور کون سی بنتی ہیں؟ ان امور کا علم و عرفان انسان کو محض اپنے حواس' اپنی عقل و خرد اور اپنے مشاہدے و تجربے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ علم الانسان' عمرانیات' تاریخ' فلسفہ' نفسیات اور سائنس میں انسان نے یقیناً محیرالعقول ترقی کی ہے' لیکن حیات انسانی کی صحیح' بے لاگ اور عادلانہ صورت گری کا کام آزادی اور خود مختاری کے ساتھ اس کے بس کا روگ ہی نہیں ہے۔اس سلسلے میں اس کی کوششوں کا ریکارڈ اس بات کی منہ بولتی شہادت ہے۔ وہ ایٹم بم بنا تو سکتا ہے' لیکن اس کے استعمال کا خاکہ اگر وہ خود اپنی ہی خواہشات کے مطابق مرتب کرے تو اسے اپنی اغراض جنگ میں استعمال کرکے یہ اعلان کردے گا کہ یہ قیام امن کی بابرکت سعی تھی۔

پھر زندگی کے مسائل اتنے کم' سادہ اور سہل بھی نہیں کہ انسان اپنی اغراض کے خول میں بند رہ کر انھیں حل کرسکے۔ اس میں اغراض سے بلند و بالا ہو کر گرہ کشائی کا یارا نہیں۔ آج بیسویں صدی کے اس نصف آخر میں بھی وہ قدیم اور جاہلانہ تعصبات کا شکار ہے۔ رنگ' نسل' ذات' برادری' قبیلہ' خاندان' زبان' ملک اور وطن وہ بت ہیں جن سے وہ آج تک چھٹکارا حاصل نہیں کرسکا۔ بے لوث بھلائی اور عالمی عدل و امن کے الفاظ اس کے ضمیر کی آواز نہیں' بلکہ اس کے فریب کلام کا پردہ ہیں۔

اسلام جو کہ توحید کا سراپا ہے' فکر و عمل میں کسی قسم کے منافقانہ طرز عمل کو ہرگز

برداشت نہیں کرتا۔ یہاں جو بات ہے سیدھی، صاف اور محکم ہے۔ اس کے عدل کا یہ اصول ہے کہ اپنے بدترین دشمنوں سے بھی اسی طرح انصاف برتو جس طرح تمام اولاد آدم کے لیے عدل کے اصول و قوانین ہیں۔ اس نے شرافت و عزت کا یہ اصول بنایا کہ ان کا معیار نیکی ہے، قوم و قبیلے کی کوئی نسبت نہیں۔ باطل نے اسلام کے علم برداروں اور ان اصولوں کے درمیان بڑی اونچی دیواریں حائل کرنے پر اپنا زور صرف کیا، لیکن تاریخ اپنی ساری ناانصافیوں کے باوجود یہ گواہی ضرور دیتی ہے کہ زوال و انحطاط کی تہوں کو چھو کر بھی اسلام کے نام لیواؤں نے ان اصولوں کا اس طرح پاس کرکے دکھایا کہ اس ضمن میں وہ سارے زمانے میں ممتاز نظر آتے ہیں۔

توحید ہی تقدیر انسان کا نشان اور مسلمان کی جرات نمود ہے۔ توحید ہی اس کی اخوت و اتحاد کی ضمانت اور اس کی آزادی و استقلال کی ناگزیر علامت ہے۔ پاکستان کے مسلمانوں کو بالخصوص اس حقیقت کو روح کی گہرائیوں اتار لینے کی ضرورت ہے۔ یہ وطن عزیز اسی لیے قائم ہوا تھا اور اس کی حیات دنیا اور حیات اخروی کی کامرانی بھی اسی کے فروغ سے وابس ہے۔ آج کا سامری جا کے نئے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے اور آج کا ابوجہل ہمیشہ کی طرح چراغ مصطفویؐ سے ستیزہ کار ہے۔ نئے فلسفے، نئے نعرے، بت باہر سے لاکر توحید اسلام کے بالمقابل صف آرا کیے جاتے ہیں تاکہ پاکستان کو ارتداد کی راہ پر لگادیا جائے اور جلوۂ اسلام کے اس مینارے کی توحیدی روش بجھادی جائے۔

فراست مومن یہی ہے کہ توحید اور اتحاد کے ہتھیاروں سے لیس رہ کر کفر و شرک کی عیاری کو خاک میں ملادیا جائے۔

توحید اور اتحاد

آپ کسی گھرانے کو دیکھیے۔ اس کے مختلف افراد میں ذوق' مزاج' روش اور کردار کے اعتبار سے ایک دوسرے میں نمایاں فرق نظر آئے گا۔ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ ان میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ بہ ایں ہمہ ان میں باہمی ایک جذبۂ خیر اور ایک قدر عالیہ کے احساس کا اشتراک بھی موجود ہوتا ہے جس کی بہ دولت پورا گھرانا الفت اور یگانگت کے رشتۂ لطیف میں منسلک رہتا ہے۔ مشین کی وحشت ناکیوں نے دنیا کے سب سے زیادہ متمدن حصوں کو آج اس رشتۂ لطیف کی برکت و لذت سے بڑی حد تک نا آشنا کردیا۔ انھیں یہ نہیں معلوم کہ کنبے کے افراد کس طرح ایک غیر مرئی حلاوت اور مقناطیسی کشش کے ساتھ وحدت کی کیفیت سے سرشار ہوتے ہیں۔ تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر انسانی وحدت کی دل کش ترین تصویر ایک کنبہ اور ایک گھرانا ہی پیش کرتا ہے۔

آج ہم اس صورت حال پر غور کرتے ہیں تو اس کی حیرت ناکی کا ایک پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے کہ سائنس کے انکشافات و اکتشافات اور ٹکنالوجی کے کرشموں اور کمالات نے جغرافیائی لحاظ سے تو دنیا کی طنابیں کھینچ کر اسے ایک گھرانا بنادیا' لیکن اخلاص و اخلاق اور ہمدردی و محبت میں دنیا اتنی پیچھے چلی گئی کہ قدم قدم پر انسان انسان کے درمیان بیگانگی نے جداگانہ دنیائیں بنا کر کھڑی کردیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب آپ کو تاریخ سے ملے گا۔

پہلے ذرا اس منظر کو دیکھیے۔ رات کا سناٹا ہے۔ ہنگامۂ حیات سے تھک ہار کر لوگ نیند کی آغوش میں محو استراحت ہیں اور لگتا ہے کہ پوری کائنات سوگئی ہے' لیکن نہیں۔ اس تاریک سناٹے کی گہری خاموشی میں صرف ایک شخص ایسا بھی ہے جو خالق ارض و

سما کے حضور اپنی پر خلوص عبدیت کی سرگوشی میں یہ کہہ رہا ہے :

"اے پروردگار! ساری مخلوق تیرا کنبہ ہے، رحم فرما!"

یہ آواز اور یہ دعاے دل سوز چودہ صدی پہلے محمد بن عبداللہ، ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔

اس وقت تک تاریخ عالم کا ایک واقعہ بن کر یہ جدید تضاد سامنے نہیں آیا تھا کہ انسان کا جغرافیہ ایک ہے، لیکن اس کی نفسیات پارہ پارہ ہیں۔ اس وقت دنیا ہر لحاظ سے کٹی پھٹی تھی۔ تقسیم و تفریق کے اس منظر میں رہبر انسانیتؐ نے اللہ تعالیٰ کے حضور تہجد کی تنہائیوں میں تمام مخلوق کے لیے اللہ کی رحمت سے سرفرازی کی دعا کو اپنا معمول بنایا۔ حاصل دعا کیا تھا؟ توحید اول، توحید آخر۔

یہی توحید بناے وحدت انسان بھی ہے۔ یہ بات کسی پر پیچ فلسفے کی نہیں اور نہ ہی اس میں کلیسائی اور ویدانتی تصورات کی پراسرار وحدت الوجودی کیفیت مضمر ہے۔ توحید وہ روشن حقیقت ہے جس کا اعتراف کون و مکاں کی ہر شے اور خود انسان کے وجود میں بھی پایا جاتا ہے۔ انبیا علیہم السلام کے مشن کی غرض و غایت، محور اور فلسفہ یہی تھا کہ انسان کے اس شعور خفتہ کو ہدایت ربانی کے مطابق ایمان سے منور کردے اور اسے مکمل طور پر رہبر حیات بنادے۔ اسی سے زندگی میں حقیقت شناسی، خدمت، محبت، احترام، ایثار اور عدل پروری پیدا ہوتی ہے۔ اسی سے انضباط، استحکام اور لازوالی کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ اسی سے خلافت فی الارض کی خلعت فاخرہ نصیب ہوتی ہے۔ اسی سے اخلاق انسانی کو صفات الٰہی میں ڈھالنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ اسی سے رسالت، معاد، صلوٰۃ و زکوٰۃ پر بنیادی ایمان اور عظمت محمدیؐ کے رموز سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔

توحید پر ایمان رکھنے والا شخص انسانی اخوت و امن پر گہرا یقین رکھتا ہے۔ اس کا یہ علم و عرفان کہ خالق کائنات نے ایک فرد واحد سے پوری نسل آدم کا سلسلہ چلایا، محض تاریخی نہیں بلکہ ایمانی ہے۔ اللہ نے انسان کو مختلف صورتیں دیں۔ مختلف صلاحیتیں بخشیں۔ تہذیب و تمدن کا ذوق عطا کیا۔ نیکی و بدی کی پہچان دی۔ ارض و سما کی قوتوں کی تسخیر کا حوصلہ دیا۔ رزق حلال کے خزانے مہیا کیے اور زندگی بعد موت کا اساسی تصور

فراہم کیا۔ یہ وہی ایک اللہ تو ہے جس نے سمندر میں میٹھے اور کھارے پانی کی متوازی اور ملحق روشیں چلائیں' لیکن ان کا پانی آپس میں خلط ملط نہیں ہوتا۔ یہ وہی ایک اللہ تو ہے جس نے بحر کو تازہ گوشت اور موتی و مرجان سے بھردیا۔ زمین پر بلند و بالا احمرو اسود پہاڑ کھڑے کردیے اور آسمان کو مہ و پروین سے مزین کیا۔ وہ رات کی تاریکی کو پھاڑ کر صبح روشن کرتا ہے۔ اللہ نے گردش لیل و نہار سے موسموں میں تغیرو تبدل اور ان کی تبدیلی سے پھلوں' سبزیوں اور اجناس کے پکنے میں ایک رواں تسلسل قائم کیا۔ اس نے انسان کے سکون و آرام اور اس کی تمدنی سرگرمیوں کی چہل پہل کے لیے موزوں اوقات کا اہتمام کیا۔ اس نے چوپایوں کے پیٹ سے گوبر و خون کے درمیان سفید اور لذیذ دودھ کی دھاریں نکال دیں۔ اس طرح کائنات کی ہر جان دار و بے جان چیز اسی ایک پروردگار عالم کی رحمت' اس کی ربوبیت' اس کے عمل تخلیق اور اس کے نظام تدبیر و تدبر کے بے کراں سلسلے میں سموئی ہوئی ہے۔ اس خلاق ازل و ابد کی کس کس نعمت کا ذکر کیا جائے۔ چار سو ہست و بود کا جو کارخانہ پھیلا ہوا ہے اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جو غیر اہم ہو اور اس کی بے انتہا حکمتوں کی آئینہ دار نہ ہو۔

جب وہ رب کریم اپنی قدرت و قوت ہی میں نہیں بلکہ اپنی تمام صفتوں میں یکتا و بے مثل ہے تو انسان اپنی زندگی کے کسی گوشے کو بھی اس کی رحمتوں' اس کی فرماں روائی اور اس کے قانون سے مستثنیٰ قرار دینے کا حق نہیں رکھتا اور نہ قرار دے سکتا ہے۔ تخلیق اسی کی ہے تو سروری بھی اسی ذات اعلا و برتر کو زیبا ہے۔ توحید کا یہی تصور ہے جو اللہ کے آخری رسول حضرت محمدؐ اور آخری کتاب قرآن حکیم نے انسان کو پوری یک سوئی اور دل سوزی سے دیا ہے۔ یہ وحدت انسان کی محکم ترین' سچی اور حقیقی بنیاد ہے جس پر بہت زور دیا گیا ہے۔ نتیجے کے طور پر اس کے ان گنت مضمرات اگرچہ عقل و خرد پر خود بہ خود منکشف ہوسکتے تھے' تاہم اس عقیدے کے اہم ترین لوازمات کو پوری صراحت کے ساتھ کھول کھول کر پیش کردیا گیا تاکہ انسان کے فکر و عمل میں اعراض و کوتاہی کے لیے کسی عذر کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ حتیٰ کہ اس کے عمرانی عواقب و نتائج کی نشان دہی کرتے ہوئے یہاں تک بتا دیا گیا کہ مرد اور عورت کے ایک جوڑے سے انسانی سلسلے کی پیدائش کے باوجود رنگ' نسل' قوم اور قبیلے کا فرق

تمھیں اس مغالطے میں مبتلا نہ کردے کہ یہ فرق کسی بڑائی کی بنیاد ہے۔ اس فرق و اختلاف کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ پہچان کی علامتیں ہیں۔ رہا عزت و تکریم کا سوال تو اللہ کے نزدیک وہی سب سے زیادہ صاحب توقیر ہے جو سب سے زیادہ متقی و پرہیزگار ہے۔

اس طرح توحید کا عقیدہ اپنے مختلف پہلوؤں سے انسان میں اسلامی عظمت و وحدت کا شعور پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن توہم پرست نہیں بلکہ بندۂ توحید ہوتا ہے۔ اس کے دل میں خوف صرف اللہ کا ہوتا ہے اور وہ کارگاہ حیات میں بزدل نہیں بلکہ جری اور بہادر ہوتا ہے۔ اس کے اندر اپنے ابنائے جنس کے لیے محبت و خدمت کا جذبہ موج زن ہوتا ہے اور وہ اپنے ہر قول و فعل سے احکام الٰہی کی پابندی کے جذبے کے تحت عالم بشری کا دلی خیر خواہ اور خادم ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل و دماغ کی ساری قوتوں کے ساتھ جو کچھ کہتا اور کرتا ہے وہ اللہ اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوش نودی کے لیے کرتا ہے۔ اس کی محبت اور اس کا غصہ دونوں اللہ ہی کے لیے ہوتے ہیں۔ غصے کے جذبے کو جب وہ ناگزیر مواقع پر کام میں لاتا ہے تو وہ بھی اپنے نفس کی ذاتی خواہش کے نتیجے میں نہیں بلکہ دفاع توحید کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے لاتا ہے۔ بندۂ توحید بندۂ آزاد ہوتا ہے۔ تاریخ پر نگاہ ڈالیے۔ یہی کردار تقاضائے ایمان اور یہی کردار سرمایۂ تاریخ انسان ہے۔ پاکستان کی اساس اور مقصود ایسا ہی بندۂ آزاد ہے۔

میں اس ملک کے باشندوں کو پکار کر چونکا دینا چاہتا ہوں کہ آپ اپنے اصل مقام و منصب کو پوری طرح پہچانیں۔ تاریخ کے اس اہم دوراہے پر آپ کو یہ نظر آجانا چاہیے کہ آپ آزمائش کی کس کٹھن گھڑی سے گزر رہے ہیں۔ آپ کے ایمان اور آپ کی آزادی کو اس عہد کے اس خطرناک چیلنج کا سامنا ہے جو آپ کے اس راز کو اچھی طرح جانتا ہے کہ آپ کا ایمان اور آپ کی آزادی دونوں ایک ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک پر ضرب لگانے کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے کا وجود خود بہ خود مختل ہوجائے گا۔ عقیدۂ توحید کے تحت آپ یہ کبھی نہ بھولیں کہ ایمان و آزادی کی اصل ایک ہے۔ یاد رکھیے کہ دشمنوں کی سب سے بڑی آرزو یہی ہوتی ہے کہ آپ پر غفلت کی گھڑی طاری کردی جائے اور اس طرح ایک ہی وار سے دونوں کو نشانہ بنایا جائے۔ غفلت میں

ڈالنے کی جو راہ آپ کے لیے چن لی گئی ہے اس میں آپ کو گم کردینے کا تیزی سے اہتمام ہورہا ہے۔ جسمانی لذتوں کی بھرمار' مادی سروسامان کا بے لگام حرص' قیادت و اقتدار کا لالچ' منشیات کا طوفان' رزق حلال سے پرہیز و گریز' خیر و خدمت کے جذبے سے اجتناب' جنسیات میں انہماک' تفرقہ و تفریق' نفرت و دہشت گردی غرض مہلک ترین زہر کی ان ساری اقسام کا انجیکشن بہ یک وقت آپ کے جسد ملی کو دیا جارہا ہے۔ آپ دشمنوں کے عزائم سے خبردار ہوجائیں اور ان ہاتھوں سے بچنے کا حوصلہ پیدا کریں جو ان راہوں سے وار کرکے آپ کے ایمان و آزادی کو ملیامیٹ کردینے کے ناپاک منصوبے بنا رہے ہیں۔

اسلام نہ تو دنیا سے منھ موڑ لینے کا نام ہے اور نہ ہی دنیا میں سرتاپا مستغرق ہوجانے کا عنوان۔ اللہ کی زمین پر اللہ اور اس کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ایمان' آزادی اور عزت و آبرو ہے۔ دنیا پرستی توحید اسلام کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ آج کی شیطانی قوتیں بھی جنھیں آپ اچھی طرح پہچانتے ہیں' آپ کو اپنے شکنجے میں جکڑ لینا چاہتی ہیں۔ نظر اٹھا کر دیکھیے! یہ قوتیں آپ کی گھات میں ہیں اور آپ کے دروازے پر ان کے خطرے کی دستک' اگر آپ سننا چاہیں تو سنائی دے سکتی ہے۔

میں آپ کو ڈرانا نہیں چاہتا۔ خوف تو مومن کو صرف اللہ کا ہوتا ہے' لیکن حالات کا جائزہ لینا' خطرات کو بھانپنا اور ان کی نوعیت و کیفیت کے مطابق روحانی' اخلاقی' ذہنی' مادی اور انتظامی اسلحوں سے لیس ہوجانا ایمان کا تقاضا ہے۔ غیر اللہ سے ڈر ایک منفی قوت ہے۔ میں آپ کو غیر اللہ سے خوف اور غیر اللہ سے وفاداری کی تمام بیڑیاں کاٹ ڈالنے کی دعوت دیتا ہوں۔ توحید الٰہی سے سرشار انسان ان تمام قوتوں کا مخالف' نڈر اور باغی ہوتا ہے جو اس کے ایمان و آزادی کو چیلنج کرتی ہیں۔ اللہ کا وعدہ ہے :

وانتم الاعلون ان کنتم مومنین (آل عمران : ۱۳۹)

(اور تم ہی غالب رہوگے اگر تم مومن ہو)

اسی جذبے کو لے کر ایک ہوجاؤ اور پاکستان کی سلامتی و سربلندی کے لیے جان لڑادو۔

ختمِ نبوت

آپ جانتے ہیں کہ عقیدۂ ختم نبوت اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے۔ ظہورِ اسلام سے لے کر اب تک تمام مسلمانوں کے دینی تصورات کی اساس یہی تصور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ نبوت آپؐ پر ختم ہوگئی اور آپؐ نے جو پیغام کائنات کو دیا وہ اللہ تعالیٰ کا آخری اور مکمل پیغام ہے۔ یہ پیغام کسی خاص قوم، کسی خاص خطے اور کسی خاص زمانے کے لیے نہیں ہے بلکہ ساری کائنات اور تمام زمانوں کے لیے ہے۔ اسی عقیدے کی بنیاد پر ہمارے تمام عقائد کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔

توحید کے بعد سب سے زیادہ اہمیت ختم نبوت کے عقیدے کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی گزشتہ کتاب یا پیغام کے لیے یہ نہیں فرمایا کہ یہ مکمل اور آخری ہے۔ اس کی حفاظت کا وہ خود ذمے دار ہے۔ اس سے قبل نبوت کے سلسلے کو ختم کرنے کے لیے نہیں فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ عقیدۂ ختم نبوت نے نہ صرف مسلمانوں کی زندگی اور کائنات کے متعلق ان کے رویے پر بہت اثر ڈالا، بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی تاریخ پر بھی اس کے غیر معمولی اثرات نمایاں ہوئے۔ قرآن حکیم کی سورۂ احزاب میں ارشاد باری ہے :

ما کان محمد و ابا احد من رجالکم ولٰکن رسول اللہ و خاتم النبیّن (الاحزاب : ۴۰)

(لوگو، محمدؐ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیّن ہیں)

خود سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت واضح طریقے سے فرمایا کہ میرے بعد

کوئی نبی نہیں ہے۔ انھی واضح ارشادات کا نتیجہ ہے کہ مسلمان بالکل یکسو ہو گئے اور ان کو اس مسئلے میں کبھی تذبذب نہیں پیدا ہوا۔ اس یکسوئی نے ان کو ایمان، یقین، فکر اور عمل کی وہ عظمتیں اور بلندیاں عطا کیں کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ بقول علامہ اقبال :

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

تقاضائے ایمان

مسلمان فلاسفہ' متکلمین اور علم العقائد کے ماہرین نے ایمان کی علمی تعریف اور خالص علمی اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اس کے مالہ و ماعلیہ پر بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ تفصیلات ہمارے اسلاف کی گہری علمیت' ان کے نکتہ رس ذہن اور ان کی حکیمانہ طرز و فکر کی آئینہ دار ہیں۔ اس بنا پر یہ تفصیلات اسلامی علوم کا ایک بیش بہا سرمایہ ہیں۔ اس سے قطع نظر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ساری علمی اور کلامی موشگافیاں دراصل ایمان کو دماغ کی راہ سے وارد کرنے کی کوششیں ہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ یہ کوششیں اپنی جگہ انتہائی وقیع ہیں' لیکن احساسات کے بندھن میں جکڑے ہوئے انسان کے لیے ایمان کی اس حلاوت کی ضرورت ہے جو اس کے دل پر اثر انداز ہو۔

ایمان کے ضمن میں حلاوت کا ذکر میں نے مجازاً اور استعارے کے طور پر نہیں کیا' بلکہ میرے ذہن میں افصح العرب والعجم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گونج رہا ہے۔ آپؐ نے ایمان کے بعض تقاضوں اور اہل ایمان کی بعض خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جس نے ان تقاضوں کی تکمیل کی اور جو ان خصوصیات کا مالک ہوا اس نے گویا ایمان کی حلاوت چکھ لی!

یقین ہے کہ آپ اس سے اتفاق فرمائیں گے کہ دماغ کے ذریعے سے وارد کرنے کی کوشش کے نتیجے میں اگر ایمان کی سعادت میسر بھی آجائے تو اس ایمان کی کیفیت شاید اس گلوکوز کی مانند ہو جو بجائے منہ کے خون کی رگوں کے ذریعے سے بدن میں پہنچایا جاتا ہے۔ اس صورت میں زبان اس کی شیرینی کے احساس سے محروم رہ جاتی ہے۔ اگر میرے اس قول کو گستاخی نہ سمجھا جائے تو میں کہوں گا کہ ذہن اور دماغ کے دروازے سے داخل ہونے والا ایمان وہ شیرینی اور حلاوت شاید نہ پیدا کرسکے جس کا ذکر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ اس تفصیل کے بعد میں ایمان کا علمی مفہوم بیان کرنے سے گریز کرتا ہوں۔

قرآن حکیم میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر خود قرآن کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ :

وانہ لتنزیل رب العالمین ○ نزل بہ الروح الامین ○ علیٰ قلبک لتکون من المنذرین ○ (الشعرا : ۱۹۲ تا ۱۹۴)

(یہ رب العالمین کی نازل کردہ چیز ہے۔ اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار روح (جبریل امینؑ) اتری ہے تاکہ تو ان لوگوں میں شامل ہو جو (اللہ کی طرف سے خلق اللہ کو) متنبہ کرنے والے ہیں)

قلب اور قرآن میں اس مناسبت کا نتیجہ ہے کہ قرآن ذہن کی بجائے دل کی راہ سے زیادہ موثر طور پر حملہ آور ہوتا ہے۔ تو آیئے اب دیکھیں کہ ایمان کے بارے میں یہ کتاب کیا کہتی ہے۔

قرآن کا تو موضوع ہی ایمان ہے اس لیے اس مسئلے پر تفصیل سے کچھ کہنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ساری کتاب کا جائزہ لیا جائے۔ یہ وہ کام ہے کہ جو نہ اب تک کوئی پوری طرح کر پایا ہے نہ کر پائے گا۔ اس لیے میں سورۂ نور کی ایک آیت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ ارشاد باری ہے :

انما کان قول المومنین اذا دعوا الی اللہ و رسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا و اطعنا و اولٰئک ھم المفلحون ○ ومن یطع اللہ و رسولہ و یخش اللہ و یتقہ فاولٰئک ھم الفائزون ○

(النور : ۵۱-۵۲)

(ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسولؐ کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسولؐ ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں' اور کام یاب وہی ہیں جو اللہ اور رسولؐ کی فرماں برداری کریں اور اللہ سے ڈریں اور اس کی نافرمانی سے بچیں)

یہ آیت صرف ایمان کی نشانی ہی نہیں بتاتی بلکہ اس کے تقاضوں کی بھی نشان دہی کرتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ساری امت مسلمہ اور خاص طور پر ملت اسلامیہ کی سب سے بڑی بدبختی اور شقاوت یہی ہے کہ ہم نے بہ حیثیت ایک فرد' ایک معاشرے' ایک رکن اور بہ حیثیت ملت اور قوم کے اللہ اور رسولؐ کی طرف بلانے والی اس پکار پر پوری طرح توجہ نہ دی'کبھی اس پر کان نہ دھرے تاکہ ہمیں وہاں سے اپنے معاملات طے کرنے اور اپنے مسائل حل کرنے کا طریقہ معلوم ہوتا۔ ہم یہ طریقہ اور یہ وسائل اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات سے حاصل کرتے تو اس فلاح اور کام یابی کے حق دار ہوتے جس کا وعدہ ہم سے اللہ نے کیا ہے۔ اس طرح ہم نہ صرف اپنے ان مسائل کا حل تلاش کرلیتے جن میں آج ہمارا بال بال جکڑا ہوا ہے بلکہ ہم اپنے ایمان کے تقاضوں کی تکمیل بھی کرلیتے۔

اللہ ہمیں اپنے ایمان اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

تصورِ آخرت

ازل سے یہ سلسلہ جاری ہے کہ ایک مرتا ہے' دوسرا پیدا ہوتا ہے۔ قومیں بھی باری باری اس بازی گاہ عالم میں آتی ہیں اور اپنا کھیل ختم کرکے چلی جاتی ہیں۔ کائنات کا جو نظام پہلے تھا وہ آج بھی بعینہ قائم ہے۔ اس محفل کی جو رونق روز اول تھی وہ اب تک اسی طرح باقی ہے۔

ایک دن ایسا بھی آئے گا جب یہ ساری بساط ہستی الٹ جائے گی۔ کائنات کی یہ مجلس درہم برہم ہوجائے گی۔ آسمان و زمین کے کرّے ٹکرا کر چور چور ہوجائیں گے۔ پھر وہ خلاق عالم اپنی صفت خلق و احسان اور جزا و سزا کے نئے مناظر دکھائے گا اور ایک نیا عالم کسی نئے نظام کے ساتھ وجود پذیر ہوگا۔

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ جس طرح افراد آتے ہیں اور فنا ہوتے ہیں اسی طرح ایک دن آئے گا جب پوری دنیاے فانی پر موت طاری ہوگی اور ہر چیز فنا ہوجائے گی۔ یہ دنیا اور اس کی زندگی محض ایک امتحان گاہ ہے۔ اس زندگی کو ثبات حاصل نہیں۔ یہ فانی ہے۔ اس زندگی کے بعد جو زندگی ہوگی وہی باقی رہنے والی ہے اور اسی کا نام آخرت ہے۔ چوں کہ وہ دنیا موجودہ دنیا کے بعد قائم ہوگی اور بعد میں آنے والی چیز کے لیے آخرت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے' اس لیے قرآن کریم نے بعد کی دنیا کو آخرت سے موسوم کیا اور ہمیں یقین دلایا کہ اصل زندگی وہی ہوگی۔ ارشاد ربانی ہے :

وان الدار الآخرة لهی الحیوان (العنکبوت : ۶۴)

(اصل زندگی کا گھر تو دار آخرت ہے)

یہ زمین و آسمان' یہ شمس و قمر' یہ ماہ و انجم' یہ کائنات اور اس کے کوچہ و بازار' یہ سلسلۂ روز و شب' یہ سانس کی آمد و رفت' یہ بحر و بر' یہ کوہ و دمن' یہ بہار و خزاں'

غرض حیات و کائنات کے سارے مظاہر ایک دن فنا ہوجائیں گے۔ صرف پروردگار عالم کی ایک ذات باقی رہ جائے گی :

و یبقٰی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام (الرحمٰن : ۲۷)

(اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے)

قرآن پاک میں آخرت کا لفظ ۱۱۵ مقامات پر آیا ہے۔ اسلامی تصور زندگی میں آخرت پر یقین و ایمان کو ایسی اہمیت حاصل ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس کے تعلق سے آزاد نہیں۔ آخرت اگرچہ ایک مختصر لفظ ہے' لیکن یہ لفظ مجموعۂ عقائد ہے۔ آخرت محض ایک فکر یا ایک عقیدہ نہیں بلکہ ایک پوری زندگی کا نام ہے جو دائمی ہے اور جس کو فنا نہیں۔

اس عقیدے کا اولین حصہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو آزاد نہ سمجھے' بلکہ اس دنیا میں اپنے تمام اعمال و افعال کے لیے اللہ کے سامنے خود کو جواب دہ سمجھے۔ اس عقیدے کا لازمی جزو یہ بھی ہے کہ کائنات اور نظم کائنات کو فانی تصور کیا جائے۔ ایک وقت جسے صرف اللہ جانتا ہے' یقیناً ایسا آئے گا جب اس دنیا کا خاتمہ ہوجائے گا۔ آخرت پر ہمارے یقین و ایمان کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اس زندگی کے فنا ہوجانے کے بعد ہمیں دوسری زندگی کا بھی یقین ہو اور ہم اس پر ایمان رکھتے ہوں کہ اللہ تعالیٰ ایک دوسرا عالم بنائے گا۔ پھر ازل سے قیامت تک پیدا ہونے والی مخلوق کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ ان کے دنیاوی اعمال کا حساب لے گا اور ہر ایک کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دے گا۔ اس عقیدۂ آخرت کا یہ صرف تقاضا ہی نہیں' بلکہ اس کا جزولاینفک ہے۔ اس عقیدے میں یہ بات بھی اہم مقام رکھتی ہے کہ آخرت میں اللہ کے فیصلے کی رو سے جو لوگ نیک قرار پائیں گے وہ جنت میں جائیں گے اور جو لوگ بداعمال ٹھیریں گے وہ دوزخ میں جائیں گے۔ جنت و دوزخ کا تعلق آخرت کے ساتھ لازم و ملزوم کا ہے۔

آخرت پر یقین و عقیدے کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ کام یابی و ناکامی کا اصل معیار ہماری موجودہ زندگی کی خوش حالی و بدحالی یا پستی و بلندی نہیں' بلکہ اس کا حقیقی فیصلہ آخرت میں ہوگا اور اصل کام یابی اور ناکامی وہی ہوگی۔

اس دنیا کی رونق و دل کشی اور گلشن ہستی کی بہار و رعنائی دیکھ کر بعض لوگوں کو

یقین نہیں آتا کہ ہر چیز اس طرح مٹ جائے گی۔ ان کے لیے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز چیز یہ ہے کہ ساری مخلوقات کے بکھرے ہوئے شیرازے پھر مجتمع ہوں گے اور نیا عالم ظہور میں آئے گا۔ حال آنکہ ان کی نظروں کے سامنے آفتاب کا طلوع و غرب بھی ہے، لیل و نہار کی گردش بھی اور روز و شب کا سلسلہ بھی۔ بہار و خزاں سے لے کر موت و حیات نیز خشک زمینوں میں لہلہاتی ہوئی فصلوں تک کے سارے تماشے روز ہوتے ہیں، مگر انھیں عبرت نہیں ہوتی۔ قرآن کریم آخرت کے اس تصور کو متعدد مثالوں کے ذریعے سے ذہن نشین کراتا ہے۔

آج دانش بشر نے حیرت انگیز علوم کی ایجاد کا شرف حاصل کرلیا۔ انکشافات جدیدہ نے ہماری عقلی رسائی کی بے شمار مثالیں پیش کردی ہیں۔ ہر چیز عقل و تجربے کی کسوٹی پر پرکھی جارہی ہے۔ یہ عقیدۂ آخرت بلاشبہ ہمیں وحی الٰہی اور بارگاہ رسالت سے ملا ہے۔ عقل ہر طبیعی اور غیر طبیعی چیز سے متعلق کوئی فیصلہ صادر نہیں کرسکتی کیوں کہ اس کی رسائی محدود ہے، لیکن آخرت کا عقیدہ ایسا عقیدہ ہے جس کا تقاضا خود عقل کرتی ہے۔ اگر کسی اور زندگی کا عقیدہ نہ ہو تو پھر یہ زندگی بھی بے معنی اور بے مقصد ہوجاتی ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بے کار یا بے مقصد پیدا نہیں کی :

ربنا ما خلقت ھذا باطلا (آل عمران : ۱۹۱)

(پروردگار، یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے)

آخرت کے عقیدے و تصور کا تقاضا صرف عقل ہی نہیں کرتی بلکہ انصاف بھی یہی چاہتا ہے۔ انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آخرت قائم ہو۔ کوئی ایسی جگہ ضرور ہو جہاں انسان کے ان تمام اعمال کا محاسبہ کیا جائے جو اس نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے آخری سانس تک کیے۔ اگر وہ اچھے نقوش عمل ہیں تو ان کا صلہ ملے۔ اگر برے اعمال ہیں تو ان کی سزا دی جائے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ دنیا انصاف و عدل سے خالی ہے۔

اس دنیا اور اس دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھنے اور آخرت پر یقین نہ رکھنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ اخلاقی احتساب کا عمل یہاں بھی ممکن ہے اور جزا و سزا کا سلسلہ یعنی تعزیرات و عقوبات کا نظام تو یہاں بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہاں نہ تو

پوری طرح محاسبہ ممکن ہے اور نہ پورا انصاف، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرح کوئی علیم و خبیر نہیں جو جلوت و خلوت کے سارے راز جان سکتا ہو۔ یہ سب کچھ اسی ہستی کے حضور میں ممکن ہے جو تمام ظاہری و باطنی حالات کا مکمل علم رکھتی ہے اور ذرے ذرے سے واقف ہے۔ وہی ازروے انصاف پوری پوری جزا و سزا دے سکتی ہے۔

تصور آخرت پر اس نقطہ نظر سے بھی غور کرنا چاہیے کہ انسانوں اور جانوروں کے درمیان جو امتیازی چیز ہے وہ اختیار و ارادہ ہے۔ جانور اخلاق کے حسن و قبح کی قید سے آزاد ہیں۔ انسان بہرحال اخلاقی اعتبار سے خیر و شر کا پابند ہے۔ یہ پابندی اس کی جبلت اور فطرت ہے اور یہی چیز انسانوں میں احساس ذمے داری پیدا کرکے ان کو جانوروں سے ممتاز بناتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص احساس ذمے داری کے ساتھ زندگی کے سارے کام ٹھیک ٹھیک انجام دیتا ہے اور اس کو اس سلامت روی کی جزا نہیں ملتی تو اس میں اور دیگر حشرات الارض میں فرق ہی کیا ہوا۔ گویا انسانی شرف و برتری کا بھی تقاضا یہ ہے کہ انسان کے نزدیک آخرت اور روز جزا کی زبردست اعتقادی اہمیت ہو۔

آپ غور فرمائیے کہ کسی آدمی نے کسی کو بے گناہ قتل کیا اور خود بھی کسی حادثے کا شکار ہوگیا تو عقل کیا کہتی ہے؟ اگر عقل کہتی ہے کہ اس ظلم کی سزا ضرور ملنی چاہیے تو پھر وہ کون سی جگہ ہو جہاں اس ظلم کی سزا ملے۔ یقیناً وہ آخرت ہی ہوسکتی ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر عقل یہ کہتی ہے کہ آخرت کا ہونا فطری ہے۔ یہ تو ایک انفرادی جرم کی مثال تھی۔

دنیا میں ہزاروں افراد ایسے بھی ہیں جو اپنے غلط اعمال و افکار کی وجہ سے ہزاروں لاکھوں زندگیاں تباہ کردیتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسے بھی افراد ہیں جن کے حسن فکر و عمل سے لاکھوں زندگیاں سنور جاتی ہیں۔ کیا ان دونوں کی زندگیاں یکساں کہلائیں گی اور کیا دونوں کا انجام یکساں ہونا چاہیے؟ ہرگز نہیں، قرآن کریم نے واشگاف الفاظ میں اعلان کردیا کہ نیکی اور بدی برابر نہیں ہوسکتیں۔ اس فرق و امتیاز کا اصل مقام آخرت ہی ہے۔ یہ دنیا تو محض امتحان گاہ ہے۔ ارادہ و اختیار کے صحیح و غلط استعمال کی جگہ ہے۔ پھر نتیجے کا بھی کوئی دن ضرور ہونا چاہیے۔ قرآن کی اصطلاح میں اسی کو آخرت

کہتے ہیں۔

تصور آخرت کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ انسانی اخلاق سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ عقیدۂ آخرت انسان میں اخلاقی ذمے داریوں کا احساس پیدا کرتا ہے اور اعمال صالحہ کا پابند بناتا ہے۔ دراصل اخلاقی قدروں اور بنیادوں کو تصور آخرت ہی سے استحکام ملتا ہے۔ اگر یہ تصور نہ ہو تو انسان کو ظلم، فسق و فجور، بدکاری اور بد اطواری سے کوئی نہیں روک سکتا۔ آخرت کا تصور ہی انسان کو سود و زیاں اور نیکی و بدی میں امتیاز کرنا سکھاتا ہے۔ اس امتیاز کے بغیر اخلاقی اقدار کا فروغ نہیں ہوسکتا۔

قیامت اور آخرت کو ناممکن سمجھنے والوں کا اگر ذہنی تجزیہ کیا جائے تو یہ بات بہ آسانی معلوم ہوجائے گی کہ کفار قریش اس کا انکار اس لیے کرتے تھے کہ عقیدۂ آخرت کے بعد ان پر کچھ اخلاقی ذمے داریاں عائد ہوجاتی تھیں۔ ان کی خواہشات نفس انھیں آخرت پر ایمان لانے سے روکتی تھیں۔ قرآن مجید میں ہے :

وما یکذب بہ الا کل معتد اثیم (المطففین : ۱۲)

(اور اسے نہیں جھٹلاتا مگر وہ شخص جو حد سے گزر جانے والا بد عمل ہے)

وہ نقد سودے کے خواستگار تھے اور آج کا نفع چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا انداز فکر یہ تھا کہ ضمیر کے سارے تقاضوں کے باوجود آخرت کو نہ مانیں۔ سود و زیاں کے اس غلط تصور کا پردہ چاک کرتے ہوئے قرآن کریم میں فرمایا گیا :

ان ھٰؤلاء یحبون العاجلۃ و یذرون وراءھم یوما ثقیلا

(الدھر : ۲۷)

(یہ لوگ تو جلدی حاصل ہونے والی چیز (دنیا) سے محبت رکھتے ہیں اور آگے جو بھاری دن آنے والا ہے، اسے نظرانداز کردیتے ہیں)

یہ سرتا سر مادی تصور ہے اور اس کی روشنی میں جن اخلاقی اقدار کی تشکیل ہوگی ان پر مادیت ہی غالب ہوگی۔ اخلاص نام کی کوئی چیز کبھی ایسے لوگوں کے اخلاقی شعور میں جگہ نہیں پاسکتی۔ منکرین آخرت جو دلائل پیش کرتے ہیں، قرآن کریم مکمل عقلی استدلال کے ساتھ ان کی تردید کرتا ہے۔ کفار کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد جینا ناممکن ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جس کے لیے خلق و ایجاد مشکل نہیں اس کے لیے دوبارہ پیدا

کرنا کیا مشکل ہے۔ جو عدم سے وجود میں لاسکتا ہے وہ وجود کے سارے شیرازے کو منتشر کرکے پھر سے مجتمع بھی کرسکتا ہے۔

منکرین آخرت کبھی یہ ہرزہ سرائی بھی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب سارے انسانوں کے ظاہر و باطن سے براہ راست واقف ہے تو جزا و سزا کا سلسلہ یہیں کیوں نہیں شروع کردیتا؟ اس کے جواب میں قرآن آخرت کا یہ تصور پیش کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عدالت ہے اور عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ سزا و جزا سے پہلے اعمال کا مکمل اور مفصل ریکارڈ پیش کردیا جائے اور ناقابل تردید شہادتیں مہیا کردی جائیں۔ آخرت میں یہ سب کچھ ہوگا۔ ارشاد باری ہے :

اذ یتلقی المتلقیٰن عن الیمین و عن ال قعید ○ ما یلف قول الا لدیہ رقیب عتید ○ (ق : ۱۷-۱۸)

(دو کاتب اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہر چیز ثبت کر رہے ہیں۔ کوء اس کی زبان نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگراں موجود نہ ہو)

ہمارے سارے اعضا خود سارے اعمال کی شہادت دیں گے اور جس نے جو کچھ کیا ہے اس کا بدلہ مل کر رہے گا۔ قرآن حکیم میں ہے :

ینبئوا الا نسان بما قدم و اخر ○ بل الا نسان علیٰ نفسہ بصیرۃ ○ ولو القی معا ذیرہ ○ (القیامۃ : ۱۳ تا ۱۵)

(اس روز انسان کو سب اگلا پچھلا کیا کرایا بتادیا جائے گا' بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے' چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے)

آخرت کا یہ تصور تین مراحل رکھتا ہے۔ پہلا مرحلہ موت اور دفن کے بعد قبر میں بنیادی سوال کے لیے اٹھایا جانا ہے۔ قرآن میں فرمادیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اٹھائے گا۔

دوسرا مرحلہ برزخ ہے' جہاں مرنے والوں کی ارواح اپنے اپنے اعمال اور اپنے اپنے مقام و مرتبے کے لحاظ سے رکھی جائیں گی اور رکھی جاتی ہیں۔ جزا و سزا کا سلسلہ برزخ ہی میں عالم خواب کے احساس لذت و الم کی طرح شروع ہوجاتا ہے۔

تیسرا مرحلہ وہ ہے جسے قیامت کہا گیا ہے۔ اس میں ہر چیز فنا ہو کر پھر زندہ ہوگی اور اللہ کی عدالت قائم ہوگی جہاں محاسبے کا مکمل اور مفصل سلسلہ ہوگا۔ اس کے بعد جنت و دوزخ میں ان دونوں کے مستحق داخل کیے جائیں گے۔

آخرت کا عقیدہ اسلام کا جزولاینفک ہے۔ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا اور نہ کوئی خود کو مسلمان کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔

آخرت پر ایمان

آخرت کیا ہے اور اس پر ایمان لانے کی حقیقت کیا ہے؟ یہ سوال ہر ایک کے ذہن میں ابھر سکتا ہے۔ ہر شخص کو اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے خواہ وہ پہلے سے مثبت انداز میں اس کی طرف مائل ہو یا شکوک کے کانٹوں میں الجھا ہوا ہو۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں ان کے لیے بھی ضروری ہے کہ گاہے گاہے حالات کے حوالے سے اپنے ایمان کا جائزہ لیتے رہیں اور اس کی تجدید کا اہتمام کرتے رہیں ورنہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کارزار حیات میں تناؤ کے تحت ایمان سے ان کا بندھن ڈھیلا نہ پڑ جائے یا اس کا دامن سرے سے چھوٹ نہ جائے۔ یہی حکمت ہے اس فرمان الٰہی کی کہ :

یاایھا الذین آمنوا آمنوا باللہ و رسولہ والکتٰب الذی نزل علیٰ رسولہ والکتٰب الذی انزل من قبل و من یکفر باللہ و ملٰئکتہ و کتبہ و رسلہ والیوم الاٰخر فقد ضل ضلٰلا بعیدا (النساء : ۱۳۶)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل کی ہے اور ہر اس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے۔ جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوںؑ اور روز آخرت سے کفر کیا وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا)

آخرت کے لفظ سے کسی حقیقت یا صورت حال کے انجام کا تصور سامنے آتا ہے۔ اس کا اصطلاحی مفہوم' جس سے کم از کم مسلمانوں کے دل و دماغ کسی نہ کسی حد تک شناسا ہیں' یہ ہے کہ یہ دنیا جس میں ہم جی رہے ہیں اور یہ زندگی جو ہم گزار رہے ہیں

خود کافی نہیں۔ اس کا تعلق ایک اور دنیا اور ایک اور زندگی سے ہے۔ مستقبل کی وہی دنیا اور وہی زندگی آخرت ہے۔ آخرت دراصل حقائق ہستی کا وہ حصہ ہے جو مخلوق کی حدود حس سے باہر ہے۔ وہ ان دیکھی چیزوں اور غیب کا جزو ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کو انسان نے کبھی نہیں دیکھا اور گزرے ہوئے پیغمبروں کو انسانوں کی کثیر تعداد نے نہیں دیکھا اسی طرح آخرت کو انسان نے کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ آخرت کو امور غیب میں شامل کیا گیا ہے اور اسی حیثیت سے اس پر ایمان لانا لازمی قرار دیا گیا' حتیٰ کہ حصول ہدایت کی لازمی شرائط میں اسے شامل کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے :

ذٰلک الکتٰب لا ریب فیہ ھدی للمتقین ○ الذین یومنون بالغیب و یقیمون الصلٰوۃ و مما رزقنا ھم ینفقون ○ والذین یومنون بما انزل الیک و ما انزل من قبلک و بالآخرۃ ھم یوقنون ○

(البقرہ : ۲ تا ۴)

(یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے' اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے ان پرہیزگار لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' جو رزق ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں' جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں)

خود ایمان کی کیفیت و خصوصیت یہ ہے کہ اس سے شک' ریب اور تذبذب کی ہر قسم کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور عقیدے پر ایمان لانے والے کا دل اس کے یقین سے سرشار ہوجاتا ہے۔ اس کے نہاں خانۂ دماغ میں جو خیال آتا ہے' اس کی زبان سے جو لفظ نکلتا ہے اور اس کے اعضا و جوارح سے جو عمل مرتب ہوتا ہے وہ اسی کیفیت میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ ایمان کے بھی درجے ہیں۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ سے کسی نے پوچھا "ایمان کی تعریف کیا ہے؟" فرمایا :

"تمہارے نزدیک تو تعریف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتقاد رکھا جائے اور ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اللہ

تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں فنا ہو جائے۔"
شاید یہ بتانا بے جا نہ ہوگا کہ اقبال نے ایمان کی اس گہرائی و گیرائی کا تصور یوں پیش کیا :

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بو لہبی ست

آخرت پر بھی ایمان کی یہی صورت صحیح، قابل قبول اور ثمر آفریں ہوتی ہے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ :

الدنیا مزرع الآخرة

(دنیا آخرت کی کھیتی ہے)

یعنی انسان اس دنیا میں اپنے افکار و عقائد اور اقوال و اعمال کی شکل میں جو کچھ بوتا ہے وہی پکی ہوئی فصل حاصل حیات کے طور پر اسے اگلی دنیا میں ملے گی۔ ثواب و عذاب اور جنت و جہنم کی دائمی صورت پر غور کیجیے تو آخرت کے اس عقیدے میں کئی دور رس، محکم اور تقدیر ساز مضمرات پائے جاتے ہیں۔ انھی میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان کی ہستی ایک تسلسل بے کراں کا مقدر رکھتی ہے جس میں موت ایک عارضی منزل ہے۔ اس کی عمر عزیز کا ایک ایک لمحہ اپنی فنا کے اندر ہی اس لامتناہی دوام کا وجود رکھتا ہے جو دوسری دنیا کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد حساب کتاب کے مرحلے سے شروع ہوگا۔ وہاں کے بے لاگ اور خالص عدل و انصاف پر مبنی احتساب کا تصور انسان کو یاد دلاتا رہتا ہے کہ ہمیں وہاں کی قبولیت حاصل کرنے کے لیے یہاں کی زندگی کس انداز سے بسر کرنا چاہیے۔ آخرت پر ایمان اگر اس کے رگ و ریشے میں صحیح طور پر سمایا ہوا ہو تو یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ پھر وہ ایک غیر ذمے دار ہستی بن کر یہاں رہے۔ دراصل عقائد و اعمال کا سارا تانا بانا تو اس تصور کے گرد گھومتا ہے کہ کائنات کے واحد خالق و مالک نے انسان کو اس دنیا میں اپنی خلافت و نیابت کے اعزاز کے

ساتھ بھیجا ہے۔ اسی ذمے داری کی تکمیل کے قابل بنانے کے لیے اسے سلسلۂ وحی و رسالت سے ہدایت پہنچائی گئی۔ اس ذمے داری کو پورا کرنے کی خاطر بھی یہ لازمی ہے کہ آخرت کے اس تصور پر ایمان لایا جائے جو بالآخر قرآن حکیم اور سنت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں پایا جاتا ہے۔

اگر کوئی شخص اسلام کی اطاعت کا اقرار کرتا ہو' لیکن آخرت کے اسلامی تصور سے بیگانہ یا باغی ہو تو یقین کیجیے کہ ایمان کے کسی جزو سے بھی وہ فیض یاب نہیں ہوسکتا' کیوں کہ ایمان و اسلام میں آدھے پونے پر سمجھوتہ کرلینے کی کوئی گنجائش سرے سے موجود نہیں۔ اسی حکمت بالغہ کے تحت قرآن حکیم نے حقیقت کے دوسرے مظاہر سے آخرت پر ایمان کا رشتہ جوڑا ہے۔ فرمایا :

فالذین لا یومنون بالآخرۃ قلوبھم منکرۃ و ھم مستکبرون

(النحل : ۲۲)

(مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ان کے دلوں میں انکار بس کر رہ گیا ہے اور وہ گھمنڈ میں پڑ گئے ہیں)

دوسری جگہ فرمایا :

و ان الذین لا یومنون بالآخرۃ عن الصراط لنٰکبون (المومنون : ۷۴)

(مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ راہ راست سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں)

ایک جگہ یہ ارشاد ہے :

و ستردون الیٰ علم الغیب والشھادۃ (التوبۃ :۱۰۵)

(پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کو جانتا ہے)

دوسری صورت میں فرمایا :

ان الینا ایابھم○ ثم ان علینا حسابھم (الغاشیۃ : ۲۵-۲۶)

(ان لوگوں کو پلٹنا ہماری طرف ہی ہے' پھر ان کا حساب لینا ہمارے ہی ذمے ہے)

آخرت پر ایمان کو اس دنیا میں انسان کے موقف و کردار کے ساتھ قرآن حکیم میں اور بھی متعدد مقامات پر اس طرح منسلک کیا گیا ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے

کسی طرح جدا نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقت آخرت کا یہی فہم و ادراک ہے جس سے اس کی دوگونہ حیثیت ابھرتی ہے۔ یہ کائنات کے تصور کی صحت و جامعیت کا نشان بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ وہ قوت بھی ہے جو انسان کو باطل کی پگڈنڈیوں سے نکال کر صراط مستقیم کی شاہ راہ پر لے آتی ہے۔ جس طرح مکے کے شہر میں واقع کعبہ نماز کی ادائی کے لیے پوری دنیا کا مرکز ہے' اسی طرح آخرت کے اسلامی تصور پر ایمان لانا پوری زندگی کو اس تسلسل توحید کی اہم ترین آخری کڑی سے منسلک کردیتا ہے جو انسان کو کرۂ ارض پر خلیفتہ اللہ بناکر بھیجے جانے سے شروع ہوا۔

اس سے یہ راز کھل جاتا ہے کہ اسلام نے رہبانیت کو سختی کے ساتھ رد کیوں کردیا۔ انسان کا مقام و منصب یہاں یہ نہیں ہے کہ وہ پہاڑوں' جنگلوں اور غاروں میں خلوت کے گوشے تلاش کرکے دھونی رما کر بیٹھ جائے۔ آخرت پر ایمان صحیح کی راہ جوگ کی تنہائیوں میں سے گزر کر نہیں جاتی۔ اس کا راستہ تہذیب و تمدن کے خار زار سے گزرتا ہے' لیکن اس عجیب شان سے گزرتا ہے کہ مسافر کا دامن کجی کے کانٹوں سے تار تار نہیں ہوتا اور وہاں سے گزرنے والا گم راہیوں کی دلدل میں پھنس کر نہیں رہ جاتا۔ دنیا اگر اس کے لیے چھوڑ کر بھاگ جانے کی جگہ نہیں تو یہ ایسا مقام بھی نہیں کہ یہاں کی عارضی راحتوں کو سمیٹ لینے کے لیے اسی کو منزل مقصود ٹھیرالیا جائے۔ دنیا کا اکتساب جائز بلکہ ضروری ہے' لیکن دنیا کا پجاری بن جانا اپنے منصب کی توہین اور خود توحید کی تکذیب ہے۔

آج میں جب پوری دنیا کے مسلمانوں کی حالت پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ان میں وہ خدا ترسی' قناعت' صحت اعتقاد' جرات کردار اور عظمت فکر و عمل نہ ہونے کے برابر دکھائی دیتی ہے جو ایمان بالآخرت کی لازمی نشانی اور اس کا ناگزیر تقاضا ہے۔ اس اعتبار سے پاکستان میں مسلمانوں کی حالت کہیں زیادہ بے رشک اس لیے ہے کہ انھیں تجدید عہد سے گزرے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ چند دہائیاں پیشتر ہی انھوں نے اپنے رب کے حضور اس عزم و نیاز کے ساتھ والہانہ دعائیں کی تھیں کہ برصغیر میں انھیں آزادی کا ایک خطۂ زمین ایسا مل جائے جس میں وہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ پھر اپنے عمل سے نوع انسان کو اس راہ امن و سلامتی کی

طرف متوجہ کردیں جس کے تعارف و تبلیغ کے لیے پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا تھا اور جس کی ضرورت آج انسان کو پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ آخرت سے غفلت، دنیا پرستی، حب جاہ و اقتدار اور مادی حرص و ہوس کی طغیانی میں ڈوب کر پاکستان کا مسلمان اپنے اسی ایمانی اور تاریخی موقف کو بھلا بیٹھا۔ دنیا کے ٹھاٹ باٹ اور جسمانی لذتوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ لینے کے اندھے لالچ میں وہ اس حد تک آگے نکل گیا کہ بہ ظاہر ایمان بالآخرت کے راستے کی یاد حرف غلط کی طرح اس کے دل سے محو ہوگئی۔ دولت کے پیچھے وہ اس طرح بھاگ رہا ہے گویا نجات کی راہ یہی ہے۔ یہ بہت بڑی آفت کی گھڑی ہے۔ پاکستان کے مسلمانوں کو ایک دفعہ اپنے حواس کے دروازے کھول کر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ انداز قارونی و فرعونی ہے، اسوۂ ابراہیمی و مصطفوی نہیں ہے۔ اس سے ان کے ایمان اور ان کی آزادی کو زبردست خطرہ ہے۔ کاش کہ وہ جاگیں، سمجھیں اور اپنی روش کو قیامت کی اس گھڑی میں فوراً بدل ڈالیں۔

تصورِ شہادت

قرآن مجید میں لفظ شہادت متعدد مقامات پر آیا ہے۔ حق کے گواہ کو بھی شہید و شاہد کہتے ہیں اور راہ حق میں جان دینے والے کو بھی۔ شہادت ایک مقدس جاں فروشی اور جرات مندانہ اعلان حق بھی ہے اور ضابطۂ اسلامی کی ایک اصطلاح بھی۔ اس کے تمام معانی کا اصل مرکز و محور بہرحال حق و صداقت' اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت اور راہ حق میں اعلا ترین قربانی ہے۔ ایمان اپنی حقیقت اور معنویت کے اعتبار سے جان و مال کی قربانی کا تقاضا کرتا ہے۔ ایک مومن راہ حق میں اپنی جان یا حق کی گواہی دے کر اس عہد کی تکمیل کرتا ہے جو اس نے اللہ سے کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے :

ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ (التوبۃ : ۱۱۱)

(حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں)

ایمان کا تقاضا ہے کہ ہر مومن مجسم شاہد حق بنے' اپنی رفتار و گفتار' اپنے قول و عمل' اپنے اخلاق و کردار' اپنی نفرت و محبت' اپنی زبان اور اپنے ہاتھ' غرض اپنے سارے اعضا و جوارح سے ظاہری و باطنی طور پر شہادت حق دیتا رہے۔ اسی شہادت حق کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کے مومن کو نیابت و امامت کا منصب عظیم عطا فرمایا۔ قرآن حکیم کہتا ہے :

و کذٰلک جعلنا کم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شھیدا (البقرۃ : ۱۴۳)

(اور اسی طرح ہم نے تم مسلمانوں کو ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم

دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو)

اللہ کی طرف سے عدل و انصاف اور وسط و اعتدال کے جس مقام پر اسے سرفراز فرمایا گیا وہاں اس بات کی وضاحت فرمادی گئی کہ رسولؐ کی شہادت تم پر ہوگی اور تمھاری شہادت لوگوں پر ہوگی۔

قیامت میں انبیاے کرام علیہم السلام اس بات کے گواہ ہوں گے کہ فکر صحیح، عمل صالح، اور نظام عدل کی الٰہی تعلیمات انھوں نے امت تک مکمل طور پر پہنچادی ہیں اور اسوۂ حسنہ بھی پیش کردیا ہے۔ ہم سے فریضۂ شہادت کے متعلق یہ سوال ہوگا کہ ہم نے رسولؐ کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے عام انسانوں تک یہ تعلیمات کہاں تک پہنچائیں؟ معلوم ہوا کہ کسی شخص یا گروہ کا اس دنیا میں اللہ کی طرف سے گواہی کے منصب پر فائز ہونا ہی درحقیقت امامت و پیشوائی کے مقام پر سرفراز کیا جانا ہے۔ بے شک وہ امام ہے جس نے ہر حال میں اللہ کی گواہی دی ہو۔ یقیناً یہ بہت بڑی فضیلت ہے، لیکن یاد رہے کہ یہ ایک عظیم ذمے داری بھی ہے۔ جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امت کے لیے خدا ترسی، راست روی، عدل و حق پرستی کی زندہ شہادت بنے اسی طرح امت کو بھی تمام دنیا کے لیے زندہ شہادت بننا چاہیے۔ ایک مومن کے قول و عمل اور اس کے ایثار و قربانی کو دیکھ کر دنیا کو معلوم ہو کہ خدا ترسی اس کا نام ہے، راست روی یہ ہے، عدالت اس کو کہتے ہیں اور حق پرستی کا معیار یہ ہے۔ اگر ہم اللہ کی بارگاہ میں اس بات کی شہادت نہ دے سکے کہ جو ہدایت حضورؐ کے ذریعے سے ہم تک پہنچی وہ ہم نے اللہ کے بندوں تک پہنچادی تو زمین کے سارے فتنہ و فساد کے لیے شیاطین و مفسدین کے ساتھ ہم بھی ماخوذ ہوں گے۔ کیوں کہ نبیؐ کی نیابت ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ جس طرح آپؐ نے انتہائی ایذا رسانی، شدید ترین مواقع اور سخت ابتلا و آزمائش کے باوجود اس دنیا میں حق کی پوری پوری شہادت دی اور اللہ کی نازل کردہ ہدایت دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچائی، حتیٰ کہ زمین سے فتنہ و فساد دور ہوا اور نظام حق برپا ہوا، اسی طرح ہمیں بھی اسی وقت امامت کا فخر حاصل ہوگا جب ہم سارے موانع اور ساری مشکلات کے باوجود نظام حق قائم کردیں۔ یہ سنت انبیاؑ ہے کہ اس راہ میں سخت ترین مقامات بھی آتے ہیں، اپنے لہو میں نہانا بھی پڑتا ہے، اپنے فرزند کو اپنے ہی

ہاتھوں ذبح بھی کرنا پڑتا ہے اور خود اپنی آنکھوں سے دیوار و در کو جلتے ہوئے بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ ابتلا و آزمائش کے مراحل ہیں۔ انھی مراحل سے گزرنے کے بعد منزل قیادت نصیب ہوتی ہے۔ اس ابتلا سے نہ انبیاؑ مستثنیٰ ہیں نہ امت کے خواص۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے :

و اذ ابتلیٰ ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن قال انی جاعلک للناس اماما (البقرہ : ۱۲۴)

(اور یاد کرو جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا' تو اس نے کہا "میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں")

ابتلا و آزمائش کے وہ مقامات و لمحات ایک نہیں تین تھے۔ انھی میں سے ایک آزمائش کا مقام یہ بھی تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کو اپنے اس بچے کو راہ حق میں رضائے الٰہی کے لیے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا جو انتہائی بے کسی اور بے سروسامانی میں پروان چڑھا اور باپ کی تربیت اور شفقت سے بھی محروم رہا تھا۔ جب حضرت ابراہیمؑ اس امتحان میں بھی کام یابی سے ہم کنار ہوئے تو ان کی امامت کا اعلان فرما دیا گیا۔ اس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شہادت حق آسان چیز نہیں ہے۔ اس کے امتحانات بڑے جاں گسل اور سخت ہوتے ہیں۔ معیار ایمان یہ ہے کہ سخت سے سخت مقام آئے' لیکن قدم میں لغزش نہ پیدا ہو۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت پر کوئی چیز غالب نہ آنے پائے۔ اس کی راہ میں اس کی گواہی کے لیے زن و فرزند تک کی قربانی سے دریغ نہ کیا جائے۔ یہ استقامت و شہادت امامت کی منزل تک پہنچاتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے :

و جعلنا منھم ائمۃ یھدون بامرنا لما صبروا و کانوا بٰایٰتنا یوقنون (السجدہ : ۲۴)

(اور جب انھوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ان کے اندر ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے رہ نمائی کرتے تھے)

جان دے کر اللہ کی گواہی دینا شہادت کی اعلا ترین قسم ہے۔ اس کی فضیلت کا

اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم نے راہ حق میں جان دینے والوں کے لیے موت کا لفظ استعمال نہیں فرمایا اور دوسروں کو بھی اس بات سے منع فرمایا کہ انھیں مردہ کہا جائے۔ اس سے ایمان و اسلام کے ایک خاص نقطۂ نظر کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اسلام اخروی زندگی کو دنیاوی زندگی سے افضل اور بہتر بتاتا ہے اور یقین دلاتا ہے کہ اپنی نعمتوں کے اعتبار سے اخروی زندگی سے دنیاوی زندگی کا کوئی مقابلہ نہیں۔ موت کا لفظ اور اس کا تصور انسان کے ذہن پر ایک ہمت شکن اثر ڈالتا ہے۔ اس لیے اس بات سے منع کیا گیا کہ شہدائے فی سبیل اللہ کو مردہ کہا جائے۔ کیوں کہ اس طرح جذبۂ جہاد اور جاں فروشی کی روح سرد پڑ جاتی ہے اور مادی زندگی کی محبت غالب آجاتی ہے۔
لہٰذا ہم خوب سمجھ لیں کہ جو شخص اللہ کی راہ میں جان دیتا ہے وہ حقیقت میں حیات جاوداں پاتا ہے۔ اس سے روح شجاعت بھی تازہ ہوتی ہے اور یہ تصور واقعے کے عین مطابق بھی ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کو ان کی ایمانی تربیت کے دوران یہ اچھی طرح ذہن نشین کرادیا تھا کہ شہادت حق کی وجہ سے جو امامت ملتی ہے وہ ایک عظیم الشان اور پر خطر خدمت بھی ہے۔ تم پر ہر قسم کے مصائب کی بارش ہوگی، سخت آزمائشوں میں ڈالے جاؤ گے اور جب صبر و ثبات اور عزم و استقلال کے ساتھ بڑھتے چلے جاؤ گے اور تمام مشکلات کا مقابلہ کرو گے تو عنایات کی بارش ہوگی۔
حقیقت یہ ہے کہ مصائب و شدائد، ایثار و قربانی، سرفروشی اور جاں بازی، ذوق جہاد اور شوق شہادت میں صبر و استقلال اور اللہ کی رضا جوئی کی جو مثال صحابہؓ نے پیش کی اس کی نظیر کسی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اسلام نے زندگی کے تصور میں جو انقلاب پیدا کیا تھا اس کی وجہ سے آخرت ان کی نگاہ میں محبوب تر تھی۔ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی رضا کے لیے راہ حق میں جان دینے کو ایک معمولی چیز تصور کرتے تھے۔ ان کا طرز عمل اس بات کا شاہد تھا کہ اگر اس سے بھی بیش بہا کوئی متاع ہوتی تو وہ اللہ کی گواہی کے لیے قربان کر سکتے تھے۔ انھیں آہنی زنجیروں میں جکڑا گیا تب بھی انھوں نے اللہ ہی کی شہادت دی، انھیں گرم ریت پر لٹایا گیا تب بھی انھوں نے اللہ ہی کی گواہی دی۔ ان کی آنکھوں میں گرم سلاخیں چبھوئی گئیں تب بھی انھوں نے اللہ ہی کی گواہی دی اور جب ان کے جسموں کو لہو لہان کیا گیا تب بھی انھوں نے **صمد صمد** ہی کہا۔

ان کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالا گیا تب بھی انھوں نے **احد احد** ہی کہا۔ یہ ابتلا و آزمائش کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ آیئے شوق شہادت پر واقعاتی نظر ڈالیں۔

حضرت حنظلہؓ اکیس سال کے تھے، اسی دن شادی ہوئی تھی، شب عروس تھی کہ رات کے پچھلے پہر اچانک جہاد کا اعلان ہوا۔ بلا کسی تاخیر کے نکل کھڑے ہوئے، اس لیے کہ اس زندگی اور حسن و شباب، نیز عروس کی لذت و حلاوت سے زیادہ پر کیف آخرت کی زندگی کو سمجھتے تھے۔ جنگ میں شہید ہوئے۔ بخاری کی روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی لاش دیکھ کر فرمایا کہ فرشتے انھیں غسل دے رہے ہیں۔

شہدا کو حیات جاوداں حاصل ہوتی ہے۔ وہ غسیل الملائکہ ہوتے ہیں۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت جعفرؓ کی شہادت دیکھ لیجیے۔ ان شہدائے بدر و احد کے حالات دیکھ لیجیے جو زمین پر لہو گرنے سے پہلے فردوس بریں میں پہنچ چکے تھے۔ یہ شہادت حق وہ مقام ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا کہ عرش بھی ہل جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ حدیث مروی ہے کہ عالم برزخ میں اللہ کے اکرام و انعام کی بارشوں سے سیراب ہو کر کوئی روح سعید دنیا میں واپس آنا نہیں چاہتی، مگر شہدا اس بات کی تمنا کرتے ہیں کہ پھر زندہ ہوں اور اسی طرح راہ حق میں اللہ کی گواہی دیتے ہوئے پھر شہید کیے جائیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت حق کی ذمے داری کا ایسا شعور پیدا کیا کہ تاریخ اسلام کے ہر دور میں ایمان و تقویٰ رکھنے والوں نے اتنی کثیر تعداد میں جان و مال کا نذرانہ پیش کیا کہ اسلام ایثار و قربانی اور شہادت و جاں فروشی کا دوسرا نام بن گیا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جب تک انسان اس دنیا میں زندہ ہے، رنج و غم اور مصیبت و الم سے دوچار ہونا ہی پڑتا ہے، لیکن یہ آخرت کی مصیبت کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ پھر یہ کہ جو جان عزیز اسے بخشی گئی وہ کسی کی امانت ہے۔ اس کی کچھ ذمے داریاں ہیں۔ وہ اللہ کی رضا کے حصول کے لیے اس کی امانت اسے واپس کرکے بجا طور پر فخر و مسرت محسوس کرتا ہے۔ سنگین حالات میں بھی حق کی گواہی دے کر فرض کی تکمیل کی لذت محسوس کرتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ زمین میں جب فتنہ و فساد برپا ہونے لگے، نظام عدل و انصاف کا شیرازہ بکھرنے لگے اور معاشرہ اللہ کی حاکمیت سے آزاد ہونے

لگے تو اس کی ذمے داری کیا ہے۔ اسے یہ بات ذہن نشین کرادی گئی ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام فساد فی الارض ہی دور کرنے کے لیے تشریف لائے اور اب یہ ذمے داری ان تمام لوگوں کی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے دوسروں پر شہید و شاہد بنایا ہے۔

چوں کہ نظام حق کی پامالی اور زمین کا فتنہ و فساد بھی وہ مرحلہ ہے جو ایمان والوں سے شہادت کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس لیے یہ بھی ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ قرآن کی نگاہ میں زمین کا فتنہ و فساد کیا چیز ہے؟ مخ آیات کے بہ غور مط سے یہ پتا چلتا ہے کہ قرآن حکیم کے مطابق اللہ کے مقابلے میں خود مختاری اختیار کرنا فساد ہے۔ ہر طرح کے ناروا ہتھکنڈوں سے ناج مقاصد پورے کرنا ا شتر بے مہار بن کر رہنا فساد ہے۔ فواحش کا ارتکاب کرنا فساد ہے۔ حق کو ماننے سے انکار کرنا فساد ہے۔ اللہ کی بندگی اس کے قوانین کی اطاعت کی حدود سے نکل جانا فساد ہے۔ اسی فساد کو دور کرنے کے لیے جب ایک مومن آگے بڑھتا ہے تو وہ مجاہد ہوتا ہے۔ اس مقدس سفر کے لیے تما کو برداشت کرنا مستوجب اجر ہے۔ صحابۂ کرامؓ شوق شہادت میں دور دور سے پا پیادہ آتے تھے۔ یمن سے ایک صحابیؓ اسی شوق میں حاضر ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تمھارے والدین زندہ ہیں؟ کہا ہاں! فرمایا ''ان کی خدمت کرو' وہ بھی جہاد ہے۔''

خطرناک مواقع پر اظہار حق کرنا بھی جہاد ہے۔ ترمذی کی حدیث ہے کہ :

افضل الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر (ابو داوٗد۔ ترمذی)

(سب سے افضل جہاد جابر سلطان کے منھ پر انصاف کی بات کہنا ہے)

ایسے جاں نثار اور جاں باز بندے کا انعام یہ ہے کہ اگر وہ اس راہ میں اپنی جان دے دے تو اس کو وہ متاع عزیز بخش دی جاتی ہے جو راہ حق میں اس نے قربان کی ہے۔ انھی جاں نثاروں کا نام شریعت کی اصطلاح میں شہید ہے۔ صحیح مسلم میں ان کے متعلق یہ روایت آئی ہے کہ یہ قیامت کے دن اپنے اسی خونیں پیراہن میں اٹھیں گے۔ اس قبائے گلگوں کے اعزاز کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ شہادت وہ بلند رتبہ ہے جس کی تمنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کی۔ مسلم کی روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں اور دوبارہ مجھے زندگی ملے اور میں اس کو بھی قربان کردوں اور پھر تیسری زندگی ملے اور اس کو بھی میں

اللہ کی راہ میں نثار کردوں۔ سورۂ الحجرات میں ارشاد ہوا :

انما المومنون الذین آمنوا باللہ و رسولہ ثم لم یرتابوا و جٰھدوا باموالھم و انفسھم فی سبیل اللہ اولٰئک ھم الصٰدقون

(الحجرات : ۱۵)

(حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے پھر انھوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں)

حضرت امام حسینؓ نے اسلام کے ارتقا کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اسلامی تاریخ کے جملہ واقعات ان کے سامنے ہوئے۔ شہادت کے اسرار و رموز سے ان کو مکمل آگہی تھی۔ آغوش نبوت کے پروردہ تھے۔ خلافت راشدہ کا عہد زریں دیکھا تھا۔ انھوں نے مراحل دعوت و تبلیغ کو آزمایا اور مسلمانوں کے رجحانات کا جائزہ لیتے رہے۔ جب نظام عدل کو خطرات سے گھرا ہوا دیکھا تو صبر' ایثار اور ایمانی جرات کی وہ مثال قائم کی جس سے تاریخ انسانیت کی پیشانی چمک اٹھی۔

جس چیز کو امام حسینؓ نے حق سمجھا اس کے لیے مال و متاع' خویش و اقربا' نفوس و جاں سب کچھ قربان کردیا۔ صبر' ہمت و عزیمت' ایثار' اولوالعزمی' مظلومی اور محصوری کے باوجود اللہ اور رسولؐ کے احکام کی موبہ مو اطاعت' اسوۂ حسینؓ کے قابل تقلید پہلو ہیں۔ اللہ کی رضا کے سوا کوئی اور چیز ان کو مطلوب نہ تھی۔ اللہ کی رضا کے لیے سب کچھ قربان کردینا اور مصائب برداشت کرنا ہی اصل شہادت ہے۔

مقامِ شہادت

ایمان و اسلام پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کی راہ ہے۔ ابتلا و آزمائش کے مراحل سے گزرنے کے بعد ہی احکام الٰہی کی اطاعت کا عہد تکمیل کی منزل کو پہنچتا ہے۔ اس راہ میں مصائب بھی ہیں اور شدائد بھی۔ فقر اور فاقے بھی ہیں اور جان و مال کی بازی بھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس جاں فروشی کے باوجود راضی بہ رضا رہنا، تسلیم و اطاعت کے پورے جذبے کے ساتھ قضائے الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت سے ٹکرانے والی ہر چیز کا پوری جاں بازی کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اللہ کے سچے بندے جب ایمان کے اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں تو ان کا شمار ان نفوس قدسیہ میں ہوتا ہے کہ جو اللہ کے انعام یافتہ بندے ہیں۔ قرآن اس کاروان ایمان کے قابل احترام سالاروں کی حیثیت سے سب سے پہلے انبیاؑ کا، پھر صدیقین کا، پھر شہدا کا اور اس کے بعد صالحین کا ذکر کرتا ہے۔

شہادت درحقیقت وہ رتبۂ بلند ہے کہ جو ہر مومن کو نصیب نہیں ہوتا۔ یہ مقام جان و مال کی اس قربانی کے بعد حاصل ہوتا ہے کہ جو راہ ایمان و یقین کی سب سے بڑی آزمائش ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ :

احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا و ھم لا یفتنون

(العنکبوت : ۲)

(کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ "ہم ایمان لائے" اور ان کو آزمایا نہ جائے گا)

ایمان کی اس آزمائش اور ایمان والوں پر طوفان مصائب کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح بھی آیا ہے :

هنا لک ابتلی المومنون و زلزلوا زلزالاً شدیدا (الاحزاب : ۱۱)
(اس وقت ایمان والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے)

اللہ کی راہ میں جان دے کر جو ایمان والے حق و صداقت کی گواہی دیتے ہیں' اللہ انھیں منصب پیشوائی عطا کرتا ہے۔ یہ شہادت کی اعلا اور مقبول ترین قسم ہے۔ اس کا ابتدائی مرحلہ یہ بھی ہے کہ وہ جب تک زندہ رہے اللہ کی گواہی دیتا رہے۔

شہادت اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی اطاعت اور اس جدوجہد کو بھی کہتے ہیں کہ جو اس راہ کے موانع دور کرنے کے لیے ایک بندۂ مومن کرتا ہے۔ قول و عمل سے اللہ کے احکام کی گواہی دینے پر ہر مسلمان مامور ہے۔ اس نے اللہ سے جو عہد کیا ہے اس کا تقاضا ہے کہ ہر ماحول میں وہ کلمۂ حق کہتا رہے' ہر طوفان میں تعلیمات نبویؐ کا چراغ روشن کرتا رہے' خواہ اس کو خاک و خوں میں لوٹنا پڑے یا اپنے لہو سے نہانا پڑے یا اپنا گھر بار چھوڑنا پڑے یا اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے منھ موڑنا پڑے۔ پہلے صرف انبیاے کرامؑ شہادت حق کے منصب پر فائز ہوتے تھے۔ اب قرآن کریم نے پوری امت محمدیؐ کو امت وسط قرار دے کر تمام لوگوں کو اپنا گواہ بنادیا۔ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عالم گیر نبوت عالم گیر ذمے داریوں کی حامل ہے اسی طرح امت محمدیؐ کا ہر فرد شاہد حق ہونے کی وجہ سے نبیؐ کی نیابت میں عالم گیر ذمے داریاں رکھتا ہے۔ یہ وسیع ذمے داریاں اس سے حق کی گواہی کے لیے ہمہ گیر قربانی کا تقاضا کرتی ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ جان و مال کی جو قربانیاں راہ حق میں اس امت کے افراد نے دی ہیں' دنیا کی کسی امت کی تاریخ میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ میدان بدر کو دیکھیے کہ جہاں شمع نبوت کے پروانوں نے رضاے الٰہی کے لیے اپنی جان قربان کی۔ کیا راہ حق میں ایسے عزم محکم اور جاں بازانہ سرفروشی کی مثال بھی مل سکتی ہے کہ ایک عورت اپنے شوہر کو' اپنے بھائی کو اور اپنے لڑکے کو قربان کرکے یہ کہتی ہو کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپؐ موجود ہیں تو ہر مصیبت ہمیں گوارا ہے۔ میدان احد کو دیکھیے کہ جہاں اسلام کے سرفروشوں نے سینوں پر تیر کھائے' تلواروں کے زخم کھائے اور مسکرا کر یہ کہتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کی کہ الٰہی! تیری رضا اور تیری

جنت اس سے زیادہ عزیز ہے! کیا تاریخ کوئی مثال پیش کرسکتی ہے کہ شب عروسی میں دلہن کو چھوڑ کر کسی نے میدان جہاد کا رخ کیا ہو' جام شہادت کو شربت وصل سے شیریں تر بنایا ہو اور فرشتے انھیں غسل دے رہے ہوں؟

یہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے جس کے افراد مکے کی گلیوں میں' بدر و احد کے میدانوں میں' غزوۂ خندق اور معرکۂ حنین میں جاں فروشی کرتے رہے۔ اس شہادت اور سرفروشی کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔ جب بھی نظام عدل و حق کو باطل نے مغلوب کرنا چاہا' جاں نثاران اسلام سینہ سپر ہوگئے۔ ان کی نگاہوں میں اپنی جان کی قیمت نہیں' اللہ اور اس کے رسولؐ کی رضا کی قیمت ہے۔ اپنی ذمے داریوں کا احساس ہے۔ وہ اس روے زمین پر حق اور نظام حق کے گواہ ہیں اور یہ گواہی تختۂ دار پر بھی دینی ہوتی ہے۔ شعلوں اور انگاروں پر چل کر بھی دینی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ وہ امامت کے منصب پر فائز ہیں اور انھوں نے اپنی جان کا سودا اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں جنت کے عوض کردیا ہے!

اللہ تعالیٰ نے اس جاں فروشی کو ایسے عظیم صلے سے نوازا ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کا فرمان ہے کہ شہیدوں کا سرتن سے جدا ہوجائے' لیکن تم انھیں مردہ نہ کہو' انھوں نے راہ حق میں اپنی جان دے کر حیات جاوداں حاصل کرلی۔ ان پر اللہ کا سب سے بڑا کرم یہ ہے کہ جو چیز انھوں نے راہ حق میں قربان کی اللہ نے ان کو ہمیشہ کے لیے وہی چیز لوٹادی۔ اس سے بڑھ کر انعام کیا ہوسکتا ہے! ایک آیت میں یہ بھی ارشاد فرمایا گیا کہ ان شہدا کی ارواح اپنے پروردگار کے پاس مقام فرح و سرور میں ہوتی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ حدیث مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ راہ حق میں شہید ہونے والے لہو کا قطرہ زمین پر گرنے سے پہلے جنت میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جس کی آرزو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی۔

ذوق شہادت نے ایمان والوں کو حیات جاوداں بخشی ہے۔ ان کی نگاہ میں اس زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ ان کے عزم و استقلال' ان کے صبر و ثبات' ان کی ہمت و عزیمت' ان کی سرفروشی اور جاں بازی سے باطل قوتیں ہمیشہ لرزہ بر اندام رہیں۔ ان

کے کانوں میں حدیث نبویؐ کے یہ مقدس الفاظ آج بھی گونج رہے ہیں کہ جس نے راہ حق میں نہ کبھی جہاد کیا اور نہ کبھی اس کی تمنا کی وہ منافق کی موت مرا۔ راہ حق میں استقامت اور سرفروشی اصل ایمان ہے۔ ایک مومن اپنی اس ذمے داری کو سمجھتا ہے۔

شہادت سے عزم و استقلال' صبر و ثبات' استبداد شکنی اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی قوتوں کو فروغ ملتا ہے اور ظلم و استبداد کو زوال نصیب ہوتا ہے۔ مجھے آج کے دور میں ان صاحبان فکر و نظر کی تلاش ہے کہ جو ظلم و جبر کو مٹانے کی آرزو اور تمنا رکھتے ہوں۔

حج کی عالم گیر اہمیت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس شریعت کی تکمیل کا صحیفہ لے کر آئے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دین و دنیا کی جامعیت اور انفرادی و ملی زندگی کے ابدی اور ہمہ گیر اصولوں پر مبنی ہے۔ اس کا ایک ایک حرف اپنے اندر حکمت و مصلحت کی ایک دنیا رکھتا ہے۔ اس نے اسرار کائنات اور ارکان عبادات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

حج بھی انھی ارکان و عبادات میں ہے جن کی مصلحتوں کی طرف قرآن پاک نے اشارے کیے ہیں۔ حج کے عالم گیر اجتماع کا مقصد یہ بتایا گیا :

واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس وامنا (البقرہ : ۱۲۵)

(اور یہ کہ ہم نے اس گھر (کعبے) کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا تھا)

اس ارشاد باری سے حج کے عالم گیر اجتماع کے دو مقاصد بہت واضح ہیں۔ ایک تو ملت اسلامیہ کے لیے خانۂ کعبہ کی مرکزیت کا قیام ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ عالمی اجتماع عالمی امن و امان کی تدابیر کو موثر بنانے کے اہم وسیلے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کی مرکزیت یہ ہے کہ مختلف ملکوں اور اقلیموں میں بسنے والے، مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف لباس پہننے والے اور مختلف تمدنی روایات رکھنے والے اپنے فطری افتراق کے باوجود خانۂ کعبہ کے گرد یک زبان و یک لباس ہوکر پوری یک جہتی و ہم آہنگی اور مکمل وحدت و اشتراک کے ساتھ ایک قبلے کی مرکزیت پر اپنے یقین و ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ایمان و یقین کا اشتراک وطنیت، قومیت، تمدن، معاشرت اور رنگ روپ جیسے تمام امتیازات کو مٹا دیتا ہے۔ یہ اجتماع امت واحدہ بن کر ہر قسم کی جغرافیائی، لسانی اور قومی تفریق کی زنجیروں کو کاٹ دیتا ہے۔ ایام حج میں تمام قومیں ایک

مقام پر ایک جیسے لباس اور وضع کے ساتھ ایک خانوادے کے افراد بن جاتی ہیں۔

فتنہ و فساد اور رزم و پیکار کے اسباب جغرافیائی' لسانی اور نسلی امتیازات ہوتے ہیں' لیکن حج کی وحدت کا وہ رنگ ہے کہ جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے۔ حرمِ کعبہ اس لحاظ سے صرف امن ہی کا گھر نہیں ہے کہ وہاں ہر قسم کی خوں ریزی اور ظلم و ستم حرام ہے' بلکہ اس لحاظ سے عظیم اور وقیع بھی ہے کہ وہ منبع امن و امان دنیا کی تمام قوموں کو ایک مقدس رشتۂ اخوت سے منسلک کرکے ان ظاہری امتیازات کو کالعدم کردیتا ہے جو دنیا میں بدامنی کا سبب بنتے ہیں۔

کرۂ ارض پر بسنے والی انسانی آبادی پر ایک نظر ڈالیے۔ اس کے بے چین دلوں اور اس کی بے قرار روحوں کی فریاد سنیے۔ کیا امن و امان کی ضرورت اور خطرات جنگ سے محفوظ رہنے کے علاوہ کوئی اور مسئلہ ایسا ہے جسے بین الاقوامی سطح پر سرفہرست رکھا جائے؟ کیا قیام امن کے لیے عالمی اجتماع سے زیادہ کوئی موثر اور بہتر وسیلہ کوئی اور ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں!

آج ساری دنیا قومیت اور وطنیت کے تنگ حصار سے نکل کر انسانی برادری کے وسیع حلقے میں داخل ہونا چاہتی ہے۔ اسلام وہ واحد دین ہے جس نے چودہ سو سال پہلے ہی کعبے کی مرکزیت کا اعلان کرکے قیام امن کے لیے عالم گیر اجتماع کی اہمیت واضح کردی تھی اور ایسی صورت پیدا کردی تھی کہ ایک بار نہیں بلکہ ہمیشہ ہر سال دنیا کے سارے مسلمان اس ایک مرکز پر مجتمع ہوکر اپنی متحدہ کوششوں سے عالمی سطح پر امن و امان کے قیام میں اپنا موثر کردار ادا کرتے رہیں۔ یہ عبادت ایک ایسی عالمی عدالت بھی ہے جس کا حقیقی کرسی نشین منصف خود احکم الحاکمین اللہ ہے جس کے فیصلے سے کسی کو سرتابی کی مجال نہیں۔

یہ مرکزیت' یہ عالم گیر اجتماع' یہ مختلف تہذیب و تمدن رکھنے والی قوموں کی وحدت و ہم آہنگی کا موثر وسیلہ' اسلام کی وہ نعمت ہے جس سے دنیا کی دوسری قومیں محروم ہیں۔ بہ ایں ہمہ یہ ہماری کوتاہی ہے کہ ہم اس عالم گیر اجتماع کو بین المِلّی سطح پر زیادہ سے زیادہ نتیجہ خیز اور موثر بنانے اور اس سے بھرپور استفادہ کرنے میں ناکام ہیں۔

ہمارے بے شمار مسائل ایسے ہیں کہ جو قومی اور بین الاقوامی سطح کی اہمیت رکھتے

ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ امت مسلمہ آج جن مسائل سے دوچار ہے پہلے نہیں تھی۔ آج شرق و غرب اور جنوب و شمال کے گوشے گوشے میں مسلم آبادیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کے اپنے اپنے مقامی' غیر مقامی' سیاسی اور مذہبی ہر طرح کے مسائل ہیں' لیکن آج حج کا یہ عالم گیر اجتماع ساری دنیا کے مسلمانوں کے مسائل سے باہمی واقفیت اور متحدہ عملی تعاون کا وہ ذریعہ نہیں رہا جو اس کا ایک اہم مقصد تھا اور ہے۔

موجودہ عہد میں ساری دنیا کے مسلمان جن حالات و مسائل سے دوچار ہیں' عالمی سیاسی پس منظر میں ان کی اہمیت سے تغافل خودکشی کے مترادف ہے۔ آج دنیا کے مسلمانوں کا اولین اور اہم مسئلہ خود ان میں اتحاد و اتفاق ہونے کا ہے کیوں کہ مسلم مملکتوں کی بڑی تعداد خود باہم دست و گریباں رہتی ہے۔ فلسطین کے مسائل کے حل پر اتفاق نہیں پایا جاتا۔ ہر ملک کو ایک دوسرے سے شکایت ہے' بہ الفاظ دیگر بھائی کو بھائی سے گلہ ہے۔ اس حال میں کیا حج کے عالم گیر اجتماع کے موقع پر وہاں کی وقتی اور رسمی اخوت کو دائمی اور حقیقی وحدت کی صورت دینے کی کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی؟ حال آں کہ حج کا بڑا مقصد انفرادی و اجتماعی تزکیہ بھی ہے۔ اس صاف اور واضح حکم کے باوجود کہ :

فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول (النساء : ۵۹)

(پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہوجائے تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف پھیردو)

کیا یہ ہمارا مجرمانہ عمل اور ہماری سنگین معصیت نہیں کہ ہم غیر مسلموں کو اپنے متنازعہ امور میں ثالثی کا حق دیتے ہیں اور انھیں منصف بناتے ہیں؟ کیا یہ اسلام اور مسلمانوں کی توہین نہیں ہے؟ ہم اپنی عظیم جمعیت اوز دنیا کی موثر اور اہم تعداد ہونے اور اپنا ایک مکمل ضابطۂ حیات اور لائحۂ عمل رکھنے کے باوجود خود اپنا بلاک اور اپنی مجلس اقوام متحدہ کی تنظیم سے قاصر ہیں۔ سارے اسلامی ممالک واضح طور پر بڑی طاقتوں میں سے کسی نہ کسی سے وابستگی رکھتے ہیں۔

یہ ہماری بے حسی ہے کہ ہم حج کے عالم گیر اجتماع سے فائدہ اٹھا کر اقوام متحدہ سے زیادہ فعال ادارہ بنانے اور اپنے سارے مسائل کے حل کی راہیں تلاش کرنے کی

طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔

غالباً ایسا اس لیے ہے کہ مسلم ممالک اپنی بہتر اقتصادی پوزیشن کے باوجود سائنسی علوم اور جدید ٹکنالوجی سے محروم ہیں۔ انھیں اپنے آپ پر اور اپنی قوت و جمعیت پر اعتقاد و اعتماد نہیں۔ سائنسی علوم سے محرومی ایک الگ المیہ ہے، آج تو دفاع کے ان وسائل کی بھی کوئی اہمیت نہیں جو جدید ٹکنالوجی سے عاری ہیں۔ غالباً اسی محرومی اور خامی کی بنا پر ہم آج تک بیت الاقدس کو آزاد نہیں کراسکے۔ اسرائیل کا خنجر ہمارے جسم ملی میں پیوست ہے اور اس کا زہر پھیلتا جارہا ہے۔ ہم اپنے قبلہ یعنی مرکز میں مجتمع ہوکر قبلۂ اول کی بازیابی کے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔ جدید ٹکنالوجی سے ہماری محرومی نے ہمیں روسی اور امریکی بلاکوں میں تقسیم کرکے ہم سے ہماری ہمت، ہماری عزیمت، ہماری غیرت اور ہماری حسیت چھین لی ہے۔ ہم اپنے دفاع کے لیے ان کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ان کے اشارۂ چشم و ابرو کے منتظر رہتے ہیں۔ لبنان میں مسلمانوں کا خون بہتا ہے، مگر ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ اسرائیل عربوں کی سرزمین پر قبضہ کرکے نئی بستیاں بساکر ان کی ہیئت بدل رہا ہے اور ہم خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ افغانستان کا مسلم کردار بدلا جارہا ہے، لیکن ہماری بے بسی عبرت و حیرت کا مرقع بنی ہوئی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہورہا ہے کہ ہم اپنے اس عقیدے کا استحکام کھو بیٹھے کہ تمام مسلمان فرد واحد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آج عالمی پریس اور ذرائع ابلاغ پر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ اپنی باتیں اصل سیاق و سباق کے ساتھ پیش کرنے کے لیے ہماری اپنی کوئی خبر رساں ایجنسی نہیں اور پھر یہ کہ ہم خود باہم دست و گریباں ہیں۔ ہم حج کے عالم گیر اجتماع کی روحانی برکتوں سے فائدہ اٹھانے اور اتحاد و اتفاق کے حبل متین کو تھامنے کے اہل نہیں رہے، محض اس عبادت کی اہمیت پر اکتفا کرتے ہیں۔

اسی طرح کی اہمیت رکھنے والے ان ایشیائی اور مغربی ملکوں کے مسلمانوں کے مسائل ہیں جنھیں تحفظ حاصل نہیں ہے۔ جگہ جگہ مسلمانوں کی خوں ریزی ہورہی ہے۔ انھیں ملک بدر کیا جارہا ہے۔ ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہورہا ہے تاریخ میں وہ الم ناک واقعات لہو سے لکھے جائیں گے۔

ان سارے ممالک کے مسلمان اس مرکز یعنی ام القریٰ میں ہر سال حج کے موقع پر

جمع ہوتے ہیں، مگر اس عالم گیر اجتماع کے اہم مقصد کا ادراک نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مسلمان جب تک ایک نظم حکومت یا خلافت کے ماتحت تھے، حج کا موقع ان کے لیے سیاسی تنظیم کا سب سے زریں موقع ہوتا تھا۔ تمام اہم امور مملکت یہیں طے پاتے تھے۔ اسپین سے لے کر سندھ تک کے والی اور حکام جمع ہوتے تھے اور خلیفہ کے سامنے مسائل پر بحث کرتے تھے۔ متنازع مسائل کا حل نکالا جاتا تھا اور آئندہ کے لیے ملی سطح پر حکمت عملی کا تعین کیا جاتا تھا۔ تبلیغ دین کے طریقے کی وضاحت ہوتی تھی۔ علما اپنے افکار تازہ سے متعلق مذاکرے کرتے تھے۔ تجارتی اور اقتصادی پالیسیاں مرتب ہوتی تھیں۔

اسلام کے عہد اول میں حج کے عالم گیر اجتماع کی جو معنویت تھی اسے آج پھر بہ روے کار لانے کی ضرورت ہے۔ آج ہم جہاں بھی ہیں اپنے بہت سارے وسائل کے باوجود مغلوب ہیں۔ ہماری سرزمینوں پر دشمنوں کا قبضہ ہوتا جارہا ہے۔ ہم نفاق کے مرض میں گرفتار ہوچکے ہیں۔ کعبے کی مرکزیت جو توحید پیدا کرنا چاہتی ہے اس سے دنیاے اسلام کی عملی زندگی یکسر خالی ہوگئی۔ حال آنکہ آج ہمارے مسائل جتنے سنگین ہوگئے وہ اس امر کے متقاضی ہیں کہ ہم حج کے اجتماع کو اپنا سب سے بڑا ملی پلیٹ فارم قرار دے کر پوری ایمانی جرات کے ساتھ اتحاد کی برکت پر یقین رکھتے ہوئے اپنے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے کوئی لائحۂ عمل مرتب کریں اور جدید ٹکنالوجی حاصل کرکے اللہ کے اس دین کو غالب کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے :

لیظہرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون (الصف : ۹)
(تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کردے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو)

حج کا یہ عالم گیر اجتماع متذکرہ مسائل کے تناظر میں آج پہلے سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ہمیں ایک ایسے پلیٹ فارم کی ضرورت ہے جہاں ہم وطنی، لسانی اور طبقاتی تفریق کے بغیر متحد ہوسکیں۔ حج کا اجتماع یہ موقع فراہم کرتا ہے۔

دوسرے مذاہب میں بھی اجتماعات کا طریقہ رائج ہے، لیکن ان میں مقامیت ہے اور ان کا دائرہ شہری یا ملکی سطح تک محدود ہے۔ اسلام ہی واحد مذہب ہے جس نے حج کی صورت میں عالمی پیمانے پر ایک مخصوص مقام پر مقررہ ایام میں جمع ہونے کا تصور دیا۔ حج کی مذہبی فرض کی حیثیت تو ہے ہی، لیکن اس میں ملی وحدت و یگانگت کے ساتھ ساتھ مفاہمت اور خیالات کی ہم آہنگی کی روح بھی کار فرما ہے جو آج ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ ہمیں اس کو نمایاں کرنے پر توجہ دینی چاہیے۔

انبیاے اول ؑ و آخرؐ

انبیاے اولوالعزم کے سلسلۂ زریں کے مقام اول پر حضرت آدم علیہ السلام فائز ہیں اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و سلم بلاشبہ اس سلسلے کے مختتم ہیں۔

حضرتِ آدمؑ

حضرت آدم علیہ السلام نبی اولوالعزم ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کو بنایا اور چاند' سورج ' ستارے' دریا اور پہاڑ اپنے اپنے فرائض انجام دینے لگے تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے خطاب فرمایا کہ اب وقت آگیا ہے کہ جس کے لیے یہ بزم سجائی گئی وہ بھی سامنے آجائے۔ یعنی یہ کہ اللہ نے اس زمین پر اپنا ایک خلیفہ بنانا چاہا جو ان تمام چیزوں کو اپنے تصرف میں لائے' دنیا میں اللہ کے منشا کو پورا کرے' اس کی نیابت اور خلافت کا حق ادا کرے اور اس کے احکام کا نفاذ و اجرا کرے۔ جب اللہ نے فرشتوں کے سامنے اس بات کا اظہار فرمایا تو فرشتوں نے اپنے خیال میں خلیفہ کا ایک تصور قائم کیا اور وہ یہ سمجھے کہ وہ جب دنیا میں آئے گا تو لازمی طور پر ہر طرف فساد پھیلائے گا' بد امنی پیدا کرے گا' آپس میں لڑے جھگڑے گا' اپنے بھائیوں کا خون بہائے گا اور لوٹ مار مچائے گا۔ اولاد آدم کی زندگی کا ایک پہلو یہ تھا جسے فرشتوں نے پیش کیا' یعنی وہ رخ جو تاریک تھا اور جس میں صرف برائی ہی برائی نظر آتی تھی۔

فرشتوں کے سامنے بنی نوع آدم کی زندگی کا یہ تاریک پہلو ہی تھا۔ اس میں جو خوبیاں پوشیدہ تھیں اور جو کمالات چھپے ہوئے تھے وہ فرشتوں کی نظر سے اوجھل تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے اندازے کے مطابق ایک تصویر پیش کی اور اس کے ساتھ وہ رخ بھی پیش کیا جس پر خود چل رہے تھے۔ اس میں اللہ کی ہربات کی تصدیق اور اس کے ہر حکم کی بلا عذر اطاعت شامل تھی۔ فرشتوں نے یہ گزارش اعتراض کے طور پر نہیں بلکہ ادب کے طور پر کی تھی۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی اس مخلوق کی زندگی کے دونوں رخ تھے۔ یعنی وہ اس کی

موجودہ اور آئندہ حالت' دونوں سے واقف تھا۔ انسان اپنے علم و عقل سے کام لے کر اس دنیا کا جو رنگ بدلنے والا تھا' اللہ اس سے واقف تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی گزارش کے جواب میں فرمایا:

انی اعلم مالا تعلمون (البقرۃ : ۳۰)

(میں جانتا ہوں' جو کچھ تم نہیں جانتے)

یہ فرمان الٰہی آدم علیہ السلام کی اللہ کے ہاں مقبولیت' قرب اور پسندیدگی کے مقام کو ظاہر کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو منصب خلافت پر فائز فرمایا اور فرشتوں کے سامنے آدم علیہ السلام کا استحقاق ظاہر کرنے کے لیے ان کی صلاحیت علم کا امتحان لیا۔ آدم علیہ السلام کو ان کی فطری صلاحیت اور استعداد کے مطابق علم اسما سے نوازا گیا تھا۔ فرشتے اس کے حامل نہ تھے۔ انھیں علم اسما حاصل نہ تھا۔ جب دونوں فریقوں سے سوال و جواب ہوئے تو فرشتوں نے اپنی لاعلمی کا اقرار کیا۔ مگر آدمؑ نے چیزوں کے نام بتادیئے اور اس طرح فرشتوں پر اپنی برتری ثابت کردی۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا میں نے پہلے ہی نہ کہا تھا کہ میں ظاہر و باطن کی ہر بات جانتا ہوں۔ زمین و آسمان کے رازوں سے باخبر ہوں۔ آدمؑ سے متعلق جو خدشے تم نے ظاہر کیے انھیں بھی جانتا ہوں اور جن باتوں کو کھل کر ظاہر نہ کیا انھیں بھی جانتا ہوں۔ اور میں کہ جو اپنی ہر مخلوق سے پوری طرح باخبر ہوں اس کی استعداد کے مطابق ہی اسے ذمے داری عطا کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ کو اپنا خلیفہ مقرر کرنے کے بعد انھیں جنت میں رکھا اور جب انھوں نے تنہائی محسوس کی تو ان کے لیے حضرت حواؑ کو پیدا کردیا اور پھر انھیں جنت میں رہنے اور کھانے پینے کی اجازت بھی دے دی۔ البتہ ایک درخت کے پاس جانے سے منع کردیا۔

یہیں سے حضرت آدمؑ اور شیطان کی دشمنی کا آغاز ہوتا ہے۔ امر الٰہی کی نافرمانی یعنی آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے ابلیس کو مردود قرار دے دیا گیا۔ اس بنا پر وہ حضرت آدمؑ کا دشمن بن گیا۔ انھیں جنت سے نکلوانے کے بارے میں اس نے دل میں

ٹھان لی کہ انھیں ضرور وہاں سے نکلوایا جائے۔ قرآن مجید میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی کے پاس پہنچا اور انھیں اپنی دوستی اور خیرخواہی کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ اگر تم اس ممنوعہ درخت کا پھل کھالوگے تو تم فرشتے بن جاؤگے۔ پھر ہمیشہ جنت میں رہوگے اور یہاں سے کبھی نہیں نکالے جاؤگے۔

آدمؑ و حواؑ دونوں شیطان کے فریب میں آگئے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ کوئی فرشتہ اللہ کی جھوٹی قسمیں بھی کھا سکتا ہے۔ انھوں نے اس درخت کا پھل کھالیا اور کھاتے ہی جنت کا لباس ان کے بدن سے اتر گیا اور دونوں شرم کے مارے اپنے بدن پر پتے چپکانے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا کہ جنت سے نکل جاؤ، شیطان تمھیں یہاں سے نکلوانے کا سبب بنا۔ لہٰذا اس کے قرب سے بھی بچے رہنا۔

حضرت آدمؑ سے لغزش ہوئی تھی، مگر توبہ و استغفار کے بعد اللہ تعالیٰ کی تائید حضرت آدمؑ کو حاصل ہوگئی۔ شیطان نے اللہ تعالیٰ سے روز قیامت تک کی مہلت مانگی کہ وہ آدمؑ اور ان کی اولاد کو بہکاتا رہے گا، مگر اللہ تعالیٰ نے مہلت دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ تو میرے مخلص بندوں کو گمراہ نہ کرسکے گا۔

شیطان کی عداوت بنی آدم کی کام یابی کے لیے سازگار لازمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت آدمؑ کے واقعے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دنیا میں بھلائی اور برائی ساتھ ساتھ رہیں گی۔ نیکی اور بدی کے رجحانات کے درمیان کش مکش اور بدی کے مقابلے میں نیکی کا غلبہ ہوگا۔ ابلیس اور اس کی ذریت کا فساد انگیزی کی طرف مائل ہونا ایک تخریبی کوشش ہے۔ جب تک نوع انسانی اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہدایت کی پیروی کرنے پر ثابت قدم رہے گی تخریب کی کبھی بن نہ آئے گی۔

یہاں انسانیت کے لیے دو ہی راستے ہیں۔ ایک انبیاؑ کی پیروی کا راستہ جسے قرآن "قصد السبیل" یعنی راہ مستقیم سے تعبیر کرتا ہے اور دوسرا انحراف کا راستہ جسے کتابُ اللہ "سبیل جائر" یعنی راہ کج کا نام دیتی ہے۔ انحراف کا راستہ اختیار کرنے والے اللہ تعالیٰ کے نظام کو شکست نہیں دے سکتے۔ کیوں کہ جب اتباع اور انحراف کی راہیں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی ہیں تو شر کے مقابلے میں کام یابی اور کام رانی ہمیشہ خیر کو ہوتی ہے جو نفع بخش اور فیض رساں ہوتی ہے۔ اگر اتباع الٰہی کے دعوے داروں کے

طرز عمل میں نفع بخشی اور فیض رسانی اتنی بھی نہ رہے جتنی انحراف کی راہ اختیار کرنے والوں کے طرز عمل میں ہو تو بہ ظاہر شر غالب ہوتا نظر آتا ہے، لیکن انجام کار خیر کی نفع بخشی ہی غالب ہوگی اور باطل کے عارضی اور ظاہری غلبے کو ہم باطل کی فتح کہنے میں حق بہ جانب نہیں ہوسکتے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیائے اولوالعزمؑ کے سلسلۂ زریں کے مقام اول پر فائز حضرت آدمؑ سے اللہ تعالیٰ نے ابتدائے افرینش پر ارشاد فرما دیا تھا کہ:

فاما یاتینکم منی ھدًی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (البقرۃ : ۳۸)

(پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا)

یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہدایات کا سلسلہ جاری رکھے گا اور جو بھی ان ہدایات کی پیروی کرے گا اسے کوئی خوف یا غم لاحق نہ ہوگا۔

تاریخ گواہ ہے کہ ہدایت الٰہی کی پیروی کرنے والوں کو نہ تو کبھی کسی کا خوف ہوا اور نہ انھیں کبھی غم نے ستایا۔ اس کے برعکس ان کے آگے دنیا ہمیشہ سرنگوں رہی اور آئندہ بھی رہے گی۔

المزمّل ؐ

المزمل حضور نبی اکرم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ و سلم کے ان صفاتی اسما میں سے ہے جن اسما سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مخاطب فرما کر اپنے خاص لطف و کرم کا اظہار فرمایا ہے۔ آپؐ جس حالت میں ہوتے اسی حالت اور صفت کے ساتھ آپؐ کو مخاطب فرمایا جاتا۔

مفسرین نے اس عنوان یعنی المزمل سے خطاب کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ابتدائے نبوت میں قریش نے دارالندوہ میں جمع ہوکر آپؐ کے بارے میں مشورہ کیا کہ آپؐ کی حالت کی مناسبت سے کوئی لقب تجویز کرنا چاہیے اور وہ لقب ایسا ہو کہ اس پر سب کو اتفاق ہو۔ کسی نے کہا کہ آپؐ کو کاہن کا لقب دینا چاہیے۔ کسی نے کہا کہ مجنون یعنی (نعوذ باللہ) دیوانہ کہنا چاہیے' لیکن ان دونوں باتوں پر اتفاق نہ ہوسکا۔ ایک نے کہا کہ آپؐ کو ساحر کہنا چاہیے۔ اس کو بھی بعض کفار نے رد کردیا' لیکن جس نے یہ لقب تجویز کیا تھا' اس نے کہا کہ بھائیو! غور کرو' وہ کرتے تو یہی ہیں' دوست کو دوست سے جدا کردیتے ہیں' عزیز کو عزیز سے علاحدہ کردیتے ہیں تو آپؐ کو ساحر نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے؟

حضور صلی اللہ علیہ و سلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپؐ کو تکلیف پہنچی۔ آپؐ رنج کی حالت میں چادر اوڑھ کر بستر پر لیٹ گئے۔ اکثر رنج و غم کی صورتوں میں یہی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ملول دیکھ کر کریمانہ شفقت اور نہایت محبت بھرے انداز سے آپؐ کی اسی حالت کے مطابق المزمل سے خطاب فرمایا تاکہ رنج و غم کا اثر جاتا رہے یعنی اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے!

حضور صلی اللہ علیہ و سلم نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عالم رنجیدگی میں فرشِ

خاک پر لیٹے ہوئے دیکھ کر "یا ابا تراب" فرمایا تھا تو اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ اس لطف و نوازش یا اس طرز خطاب سے رنج و غم کا اثر زائل ہوجائے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبیؐ کو رنجیدہ دیکھ کر اس محبت بھرے لقب المزمل سے خطاب فرمایا۔ منشا یہ تھا کہ کافروں کی ان باتوں سے جو ملال ہوا ہے وہ زائل ہوجائے۔ مخاطب فرما کر حکم دیا کہ ان کافروں کی باتوں سے رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے' بلکہ پوری پوری توجہ حق تعالیٰ کی طرف رکھنی چاہیے نیز حکم ہوا کہ رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو یعنی نصف رات یا اس سے بھی کسی قدر کم۔

مجموعی طور پر آپؐ کو پوری سورۃ المزمل میں جس بات کا حکم دیا گیا ہے یہ ہے کہ آپؐ مخلوق سے قطع نظر کرکے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اس کی عبادت نیز اپنے فرائض نبوت کی ادائی میں مصروف ہوجائیں۔ اپنے تمام افعال و اعمال اور جملہ حرکات و سکنات کی نگرانی کرتے رہیں تاکہ ہر حال میں بھروسا اللہ اور صرف اللہ پر رہے۔ مخلوق میں کسی کو نفع و ضرر کا مالک یا حاجت روا سمجھ کر اس سے امید نہ رکھی جائے اور نہ اس سے خوف محسوس کیا جائے۔ صرف اللہ ہی کی ذات پاک ایسی ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔ بلاشبہ ہر ہر چیز کا مالک وہی ہے۔ جسے وہ دے اسے کوئی محروم نہیں کرسکتا۔ جسے وہ معزز و سرفراز کرے اس کو کوئی رسوا اور ذلیل نہیں کرسکتا۔

حضرت ابن زیدؒ کا قول ہے کہ سورۃ المزمل میں جس تبتّل کا حکم دیا گیا ہے اس کا مفہوم ہی یہ ہے کہ دنیا و ما فیہا سے بے نیاز ہوکر اللہ تعالیٰ کی رضا و طلب میں انسان مصروف رہے۔ یہ دنیا سے بے نیازی ترک تعلقات اور ترک دنیا سے مختلف چیز ہے۔ کسب حلال میں مصروف رہنا' فرائض ادا کرنا' حقوق و معاملات کا خیال رکھنا' اہلِ قرابت سے تعلق رکھنا' اہل و عیال کی کفالت کرنا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرنا کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس کی بندگی کے شعور سے خالی نہ ہو' تبتل ہے۔ خاص طور پر یہ محکم عقیدہ کہ نفع و ضرر کا مالک وہی ہے' انسان میں اللہ کی طرف جھکنے کا ایک ایسا رجحان پیدا کرتا ہے کہ جس میں شرک کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یہی وہ بندگی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبیؐ کو کفار کی شر انگیزیوں پر صبر کی بھی تاکید فرمائی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات آپؐ کی شان کے خلاف ہے کہ آپؐ ان کفار و مشرکین کی باتوں کی طرف توجہ کریں۔ ان کی باتوں کا آپؐ قطعاً اثر نہ لیں اور ان سے انتقام کی بات بھی نہ سوچیں، کیوں کہ آپؐ ایک بلند مقام پر ہیں۔ آپؐ کا منصب اعلا ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ جواباً آپؐ انھیں ہرگز برا بھلا نہ کہیں، بلکہ صرف ترک تعلق کرلیں۔ یہی ہجر جمیل ہے، یعنی آپؐ ترک تعلق بھی کریں اور اپنی زبان سے انھیں جواباً برا بھلا بھی نہ کہیں۔

واضح رہے کہ قتال و جہاد کا حکم اس کے بعد نازل ہوا، اس لیے ترک تعلق کا حکم تو منسوخ ہوگیا اور یہ حکم ہوا کہ دین کی راہ میں مزاحمت کرنے والوں سے نمٹا جائے۔ ہمیں یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ یہ حکم جہاد صبر جمیل اور ہجر جمیل کے منافی نہیں ہے، بلکہ احکام الٰہی کی عین تکمیل ہے۔

اس سورۂ المزمل میں حضور صلی اللہ علی وسلم کو تسلی دی جارہی ہے کہ آپؐ کفار کی اس عارضی چیرہ دستی سے ملول نہ ہوں۔ ان کو تو اللہ تعالیٰ سخت عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے۔ آپؐ یکسوئی کے ساتھ اس کی بندگی میں مصروف رہیں۔

المدثرؐ

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو جن صفاتی ناموں سے مخاطب فرمایا ان میں بڑی معنویت ہے۔ ایک طرف تو ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان محبوبی ظاہر ہوتی ہے' دوسری جانب ان سے تبلیغ اور فریضۂ نبوت کی ادائی کے لیے آپؐ کی بے مثال مستعدی اور اعلان حق کی پیغمبرانہ بے باکی کی صفات کا اظہار ہوتا ہے۔ ان ہی صفاتی ناموں میں آپؐ کا ایک نام المدثر بھی ہے جس کے معنی ہیں اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے۔ یہ قرآن پاک کی ایک سورت کا نام ہے۔ یہ سورت قرآن کے بالکل ابتدائی دور کی ہے کہ جو سورۂ اقرا کے بعد نازل ہوئی۔

سورۂ المدثر کی شان نزول کے بارے میں مفسرین کا کہنا ہے کہ سورۂ اقرا کے بعد تھوڑی مدت تک نزول قرآن کا سلسلہ بند ہوگیا تھا۔ اس عرصے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑے قلق اور اضطراب کی کیفیت طاری رہی۔ سمع مبارک کلام الٰہی کی حلاوت اور لذت سے آشنا ہوچکی تھی۔ اس کو دوبارہ سننے کے لیے آپؐ سخت بے تاب تھے۔ اتنے لطف و کرم اور ایسی بے پایاں نوازش کے بعد اللہ کی طرف سے سکوت یقیناً صبر آزما تھا۔ قلب پاک بے چین' سمع مبارک بے تاب اور چشم حق بیں مشتاق تھی کہ درِ رحمت کھلا اور سورۂ المدثر کے ذریعے سے سلسلۂ وحی پھر شروع ہوا۔

آپؐ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں چلا جا رہا تھا کہ آسمان کی طرف سے ایک آواز سنائی دی۔ میں نے نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی تو دیکھا کہ وہی فرشتہ کہ جو حرا میں میرے پاس آیا تھا زمین و آسمان کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے خوف محسوس ہوا۔ گھر واپس لوٹ آیا۔ اسی وقت جبریل امینؑ آگئے اور مجھے سورۂ المدثر سنائی۔

عربی زبان و ادب میں کسی کو اسی حالت کے ساتھ خطاب کرنا جس میں وہ خطاب کے وقت ہو' بے انتہا شفقت اور محبت کی علامت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر جب جبریل امینؑ پہنچے تو اس وقت آپؐ چادر یا کمبل اوڑھ کر لیٹے ہوئے تھے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اس وقت آپؐ کو اسی حالت و صفت کے ساتھ مخاطب فرما کر آپؐ پر اپنے لطف و کرم کا اظہار خاص انداز میں فرمایا۔

سورۂ اقرا کے بعد دوسری سورت جو نازل ہوئی وہ المدثر ہے۔ اس وحی کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو جو ہدایات بھیجیں اور جن احکام اور ارشادات سے نوازا ان سے بہتر کوئی لائحہ عمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ المدثر کے محبت بھرے خطاب کے بعد پہلا حکم یہ دیا گیا کہ آپؐ اٹھیے' پختہ عزم اور پوری سنجیدگی کے ساتھ اٹھیے۔ آپؐ کے گرد و پیش بسنے والی مخلوق ازل میں کیے ہوئے عہد کو بھول چکی ہے۔ وہ کفر و شرک کی نجاستوں میں ڈوب چکی ہے۔ وہ بتوں کی پرستش کرتی ہے۔ اپنے فرائض اور اپنی زندگی کے مقاصد سے بے خبر ہے۔ وہ غفلت میں پڑی سو رہی ہے۔ لوگوں کو خبردار کردیجیے کہ آنکھیں کھولو' اپنی روش بدلو ورنہ عذاب الٰہی نازل ہونے والا ہے۔ اگر نجات چاہتے ہو تو ایمان کی دعوت قبول کرو اور اللہ واحد کی پرستش کرو۔ عذاب سے بچنے کا یہی ایک صحیح راستہ ہے۔ تمھاری یہ مشرکانہ زندگی تمھیں ہلاکت اور تباہی کی طرف لے جارہی ہے۔ وہ رب کہ جس نے تم کو زندگی بخشی اور تمھارے لیے حیات کے وسائل مہیا کیے اس کی رضا اور خوش نودی حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اس ایک اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پیار بھرے خطاب سے قوم کو **انذار** یعنی عذابِ الٰہی سے ڈرانے کا حکم ہوا تھا۔ اس **انذار** کے مخاطب اگرچہ سب ہی لوگ تھے' مگر خصوصیت کے ساتھ اہل مکہ اور اہل قریش تھے' اس لیے کہ ان کی پوری زندگی کفر و شرک کی آلائشوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کے باوجود ستم یہ ہے کہ انھیں اپنی برتری کا احساس بھی تھا۔ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اپنے کو معزز اور دانش مند سمجھتے تھے۔ مزید برآں وہ کعبے کے مجاور بھی تھے۔ وہ اپنے آپ کو مذہبی رسوم اور دین کا قائد سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کو اللہ کے عذاب سے ڈرانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ان کے

دلوں میں ایمان کی تخم ریزی یقیناً دشوار تھی۔ لیکن انبیاؑ کی خاص تربیت پروردگار عالم خود فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی عظمت اور اپنی کبریائی کا نقش پہلے خود ان انبیاؑ کے پاک دلوں میں بٹھاتا ہے اور ان کے ذریعے سے پھر دنیا والوں کو اپنے خالق و مالک اور اپنے رازق و معبود ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ چناں چہ المدثر کے پیار بھرے خطاب سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا کہ اٹھیے ! اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا اعلان کیجیے اور دنیا والوں کو بتایئے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ جو لوگ مشرکانہ اور جھوٹی بڑائی کا دعوا کرتے ہیں انھیں بتا دیجیے کہ ہر سر غرور پاش پاش ہو کر رہے گا۔ اصل بڑائی اللہ کی ہے اور اس کی کبریائی کا پرچم تو عرش و فرش پر ازل سے لہرا رہا ہے اور ابد تک لہراتا رہے گا۔

آپؐ ان مشرکوں سے نہ ڈریں۔ یہ آپؐ کی راہ میں مشکلات کا پہاڑ بھی حائل کردیں تو آپؐ پروا نہ کریں۔ دل میں اللہ کی کبریائی کا عقیدہ اور زبان سے اس کا اظہار کیے جائیں اس لیے کہ آپؐ کو نبوت کے منصب اعلا پر سرفراز کیا گیا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نماز کی ابتدا اللہ اکبر سے اسی بنا پر کی جاتی ہے۔

المبشّرؐ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض رسالت کے دو خاص عنوانات ہیں' انذار اور تبشیر ۔ یعنی جو لوگ کہ اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں یا کفر و شرک کی گندگیوں میں پڑے ہوئے ہیں' زندگی اور اس کے مقاصد کا شعور نہیں رکھتے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر گواہی دینے والی چیزوں پر غور نہیں کرتے' ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانا اور آخرت کی زندگی کا یقین دلا کر جزا اور سزا پر ایمان نہ لانے کے خوف ناک نتائج سے آگاہ کرنا۔ نبوت کے فرائض کا یہ وہی حصہ ہے جسے انذار کہتے ہیں اور اسی بنا پر آپ کو نذیر بھی کہا گیا ہے۔ ڈرانے کا مطلب گم کردۂ راہ انسانوں کو منزل ہدایت سے آشنا کرنا' دنیا سے مشرکانہ زندگی نیز لادین تہذیب اور معاشرے کی برائیوں کو دور کر کے امن اور عدل کا ماحول پیدا کرنا مقصود ہے' تاکہ سارے انسان اللہ واحد کی بندگی کو اپنا نصب العین بنا کر آسمانی ہدایت کی روشنی میں صاف ستھری زندگی گزار سکیں۔ مگر زندگی کے مکمل نظام کی طرف رہنمائی کے لیے صرف ڈرانے کا عمل کوئی مثبت پہلو نہیں رکھتا جب تک کہ ڈرانے کے ساتھ ساتھ بشارت اور خوش خبری نہ ہو' محض ڈرانے کا کام مایوسی پیدا کرنے کا موجب ہوگا۔ فساد کا ازالہ اور اصلاح اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب حق کا علانیہ اظہار کیا جائے' منکرین حق کو سزا کا خوف دلایا جائے اور اہل حق کی جزا کی بشارت دی جائے۔ حضورؐ مبشر بھی ہیں اور نذیر بھی ہیں۔ قرآن میں ہے :

انني لكم منه نذير و بشير (ھود : ۲)

(میں اس کی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی)

مبشر کے معنی بشارت اور خوش خبری دینے والے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپؐ ان لوگوں کو کہ جو ایمان اور عمل صالح کی زندگی اختیار کرتے ہیں، اخلاق و اعمال کی پاکیزگی کی جدوجہد کرتے ہیں، آخرت کی ناکامی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کا خوف رکھتے ہیں، ان لوگوں کو آپؐ اللہ تعالیٰ کی خوش نودی اور جنت کی بشارت دیتے ہیں اور آخرت میں کام یابی کی خوش خبری بھی دیتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ کہ جو گناہوں سے تائب ہوکر ایمان اور تقویٰ کی زندگی اختیار کرلیں انھیں آپؐ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی طرح خوش خبری سناتے ہیں جس طرح اس کی نافرمانی پر اس کے عذاب سے ڈراتے ہیں۔ کسی مکمل زندگی کے نظام کے لیے یہ دونوں عمل ضروری ہیں۔ اگر آپؐ صرف خوف آخرت دلاتے اور اللہ تعالیٰ کے اس انعام کی بشارت نہ دیتے کہ جو نکوکاروں کے لیے ہے تو اولا وہ لوگ جن کا ماضی کفر و شرک سے آلودہ ہوچکا ہے وہ نئے سرے سے ایمان اور عمل صالح کی طرف کبھی راغب نہ ہوتے اور نہ کبھی اس کی افادیت محسوس کرتے۔ دوسرے یہ کہ اپنے نفس پر جبر کرنے والے اگر تائب ہونے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے اعمال صالحہ کی جزا کی خوش خبری سے محروم رہتے تو اپنے سر دیواروں سے ٹکرا کر مرجاتے اور ان کے لیے کہیں کوئی ٹھکانا نہ ہوتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے اپنے محبوب نبیؐ کو ڈرانے والا بھی بناکر بھیجا اور احکام کی تعمیل اور صالح زندگی گزارنے پر اجر عظیم کی بشارت دینے والا بھی۔ ایک مکمل نظام زندگی کی حقیقی دعوت ایسی ہی ہوتی ہے۔ خوف انسان کو برائیوں سے بچاتا ہے اور امید اسے نیکیوں پر ابھارتی ہے۔ دل میں امید اسی بشارت کی بنا پر پیدا ہوتی ہے کہ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایمان و یقین کی دعوت دینے کے بعد دیتے ہیں۔

آپؐ کے مبشر ہونے کا یہ وصف ایک امتیاز خاص رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ آپؐ کی دی ہوئی بشارتیں اور خوش خبریاں محدود وقت اور مخصوص زمان و مکاں کے لیے نہیں ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے مبشر ہیں کہ آپؐ کی بشارت دائمی اور ابدی ہے۔ دنیا کے کسی بھی مقام کا انسان ہو جب بھی وہ کفر و شرک سے تائب ہوکر ایمان و تقویٰ کی زندگی اختیار کرلے قیامت میں وہ اللہ کی رضا حاصل کرے گا اور اس کی نجات یقینی ہے اور جو قوم راہ ایمان اختیار کرلے اس کی سلامتی یقینی ہے۔ آپؐ کی یہ بشارت

پوری نوع انسانی کے لیے ہے اور قیامت تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اگر کل اہل عرب اس بشارت سے سرفراز ہوکر اخلاق و اعمال کے بے مثل نمونے بن گئے، ان کی نیکیاں زینت تاریخ بن گئیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی وجہ سے انھیں مقبولیت حاصل ہوئی تو آج بھی جو لوگ اس شیوۂ ایمان و اخلاق کو اپنائیں گے وہ بھی اسی بشارت کے اہل قرار پائیں گے اور ان کو بھی آخرت میں کامیابی نصیب ہوگی۔

صحابۂ کرامؓ

صحابۂ کرامؓ کے حسن کردار اور حسن اخلاق کی کوئی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی، کیوں کہ ان کی تربیت اللہ کے اس محبوب نبیؐ کی نگرانی میں ہوئی جس کی پوری حیات طیبہ قرآنی اخلاق کی عملی تفسیر ہے۔

اسوۂ صحابہؓ

ابتدائے آفرینش سے انسانوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے نزول کتاب اور بعثتِ انبیاؑ کا جو سلسلہ جاری تھا اس کی تکمیل خاتم الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی۔ قرآن کریم کی جن آیات میں آپؐ کی تشریف آوری کی غرض و غایت اور آپؐ کے فرائض منصبی کا ذکر ہے ان میں ابوالانبیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا بھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :

ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم اٰیٰتک ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم (البقرہ : ۱۲۹)

(اے رب، ان لوگوں میں خود انھی کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو، جو انھیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے)

اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی یہ دعا قبول فرمائی اور دعائے خلیلؑ بطن آمنہ سے ہویدا ہوئی۔ آپؐ کی بعثت کے مقاصد میں تین ممتاز صفات کا ذکر ہے : تلاوت آیات، تعلیمِ کتاب و حکمت اور تزکیۂ اخلاق۔ اس تیسری صفت کو ہم تربیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ظاہر و باطن کی نجاستوں سے لوگوں کے دلوں کو پاک و صاف کرنا آپؐ کے فرائض نبوت میں شامل تھا۔ باطنی نجاستیں، کفرو شرک، بغض و عداوت، حب دنیا اور غرور و تکبر جیسی اخلاقی برائیاں ہیں جن سے فرد اور جماعت دونوں کا پاک ہونا ضروری ہے۔

بداخلاقیوں کے مرتکب افراد تائب ہوکر آپؐ کے فیضان تربیت سے اخلاق حسنہ کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ اللہ کی بارگاہ میں ان کو ایسی مقبولیت حاصل

ہوئی کہ قرآن میں ان کی پاکیزگی، عمل، رضا جوئی، اخلاص، صبرو ثبات، ایمان کامل اور تقویٰ کا ذکر ایک جگہ نہیں کئی مقامات پر آیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اعتقاد و اخلاق کے کمال حسن کی بنا پر ان کو ایسی سند امتیاز عطا فرمائی جس پر انسانیت کی تاریخ ہمیشہ نازاں رہے گی۔ وہ سند یہ تھی :

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم (رزین)

(میرے صحابہؓ ستاروں کی طرح ہیں۔ ان میں سے
تم جس کی اقتدا کروگے راہ ہدایت پر رہوگے)

یہ صحابہؓ درس گاہ نبوی کے وہ مبارک تربیت یافتہ افراد ہیں جو ایمان و اخلاق کی ایسی رفعتوں اور بلندیوں تک پہنچے کہ فکر و عمل کی راہوں کے لیے مہ و انجم بن گئے۔ ان کی روشنی اور ضیا پاشی کاروان انسانیت کو ان منزلوں کا پتہ دیتی رہے گی جن کی نشان دہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ان مقبول بندوں کے حسنِ کردار اور حسن اخلاق کی کوئی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ کیوں کہ ان کی تربیت بھی اللہ کے اس محبوب نبیؐ کی نگرانی میں ہوئی جس کی پوری حیات طیبہ اخلاق قرآنی کی تفسیر تھی اور جس کو طبقۂ انبیاؑ میں یہ اعزاز و امتیاز حاصل تھا کہ قرآن نے :

وانک لعلیٰ خلق عظیم (القلم : ۴)

(اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر فائز ہو)

کہہ کر اقلیم اخلاق میں اس کی تاج وری کا اعلان کیا۔ سارے عالم کے لیے قابل تقلید اسوۂ حسنہ رکھنے والی اس مقدس ذاتؐ نے اپنی بعثت کی غرض و غایت پر جن الفاظ میں روشنی ڈالی وہ بھی مندرجہ بالا آیت قرآنی کی تفسیر ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں :

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (متفق علیہ)

(میں اخلاق کے فضائل کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں)

آپؐ نے بھی اپنے فرائض کے اسی اہم پہلو کی نشان دہی فرمائی جس کا ذکر قرآنِ پاک نے تزکیہ کے لفظ سے کیا ہے۔ جب مقصد بعثت یہی ٹھیرا تو پھر اخلاقی محاسن کا کوئی نکتہ ایسا نہ رہا ہوگا جس سے آپؐ نے اپنے صحابہؓ کو آشنا نہ کیا ہو۔ ظاہر و باطن کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہا ہوگا جو آپؐ کے فیضان تربیت سے مظہر جمال و کمال نہ بن گیا ہو اور

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اسے مقبولیت نہ حاصل ہوئی ہو۔ ان صحابہؓ کے مقام و مرتبے کا اندازہ قرآن مجید کی ان متعدد آیات سے ہوتا ہے جو اس گروہ مقدس کی تعریف میں نازل ہوئیں۔

غالباً یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ اسلام میں اخلاق حسنہ اور ظاہری و باطنی تزکیے کا مقصد رضائے الٰہی ہے۔ اس سے بڑھ کر حسن تربیت کی مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ ان مقدس ہستیوںؓ کو ان کی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کی سند دے دی۔ ان کے ایمان و یقین کی بلندی کے انداز اظہار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب نبیؐ کتنے بلند مقام پر تھے۔

وہ اللہ کی الوہیت پر صرف یقین ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ اس پر اور اس کے ہر فیصلے اور حکم پر راضی تھے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے کامل اطاعت اور سپردگی کا جذبہ رکھتے تھے۔ تربیت نبوی کا یہ امتیازی جوہر ہے کہ زیر تربیت میں کمال بندگی، حق کے لیے جاں نثاری، احکام الٰہی کے لیے سپردگی اور باطل کے مقابلے میں بے نظیر شجاعت کا جذبہ پیدا ہوجائے۔ چناں چہ صحابۂ کرامؓ ایثار، حق پرستی، صبر و ثبات، عزیمت اور توکل، بے باکی اور حق گوئی اور دین کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں اپنی عظیم الشان خدمات کی بنا پر عہد کے تاریخ ساز قائد ہوئے۔

صحابۂ کرامؓ میں توکل، عفو و درگزر، باہم صلاح و مشورہ، انفاق فی سبیل اللہ، ظلم و فساد کے خلاف ولولۂ جہاد اور برائیوں سے اجتناب کی صفات تربیت نبوی کی وجہ سے پیدا ہوئیں اور بارگاہ الٰہی میں انھیں مقبولیت حاصل ہوئی۔ سارے اہل ایمان کے لیے اخلاق کا یہی اسوۂ حسنہ قابل تقلید ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم الٰہی، پیغمبرانہ طریق تعلیم، دقیق اور حکیمانہ تربیت اور بے نظیر آسمانی کتاب کے فیضان سے جاں بہ لب انسانیت میں ایک نئی زندگی پیدا کردی۔ اس میں اللہ واحد پر ایمان اور آخرت کا عقیدہ پیدا فرما کر اس کو ایک انقلاب آفریں قوت عطا کردی۔ اپنے زیر تربیت صحابہؓ کی دبی ہوئی صلاحیتوں کو ابھار کر ہر ایک کو اس کی صحیح جگہ اور اس کے اصل مقام و مرتبے تک پہنچایا۔ تاریخ نے یہ محسوس کیا کہ یہ مقام اور جگہ ان مبارک ہستیوں کے لیے خالی تھی اور مدتوں سے ان کی منتظر تھی۔ وہ افراد جو بے جان پتھر کے

مانند تھے اب جیتے جاگتے انسان بن گئے۔ وہ بے حس و حرکت اور مردہ تھے۔ اب وہ زندہ ہوکر تہذیب و تمدن اور اعمال و اخلاق کی مسند قیادت تک جا پہنچے۔ وہ پہلے گم کردہ راہ تھے اب وہ خود رہبر بن گئے۔

توحید اور اعتقاد آخرت کی بنیاد پر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اخلاقی درس گاہ قائم کی اور متعلمین کی جس طرح تربیت فرمائی اس کے نتیجے میں تربیت پانے والوں میں اعلا درجے کی قوت ارادی پیدا ہوئی' محاسبۂ نفس کا ملکہ اور امانت و دیانت پیدا ہوئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ واحد پر ایمان کمال عشق و محبت کو پہنچ گیا۔ اس کی رضا کے مقابلے میں دنیا اور دنیا کی دولت ہیچ معلوم ہونے لگی۔ یہ فانی زندگی حقیر اور آخرت کی زندگی پر کشش ہوگئی۔ اللہ ہی کے لیے جینے اور مرنے کا جذبہ' بے نظیر شجاعت اور حیرت انگیز استقامت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ دنیا کی کوئی طاقت اور جبرو استبداد کا کوئی حربہ ان کے ایمان و یقین کو کبھی متزلزل نہ کرسکا۔ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے جان و مال کی قربانی دینے اور لرزہ خیز مصائب برداشت کرنے میں صبرو استقلال کے ایسے لافانی نقوش چھوڑ گئے جن کی مثال دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔

آیئے! درس گاہ نبوت کے تربیت یافتہ' رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم اور ممتاز صحابی سیدنا بلال حبشیؓ کی استقامت اور ان کے جذبۂ توحید' ان کی جاں نثاری اور راہ حق میں شدائد کے تحمل کی اس ولولہ انگیز داستان کا مطالعہ کریں جو صداقت اور حق پرستی جیسے اخلاق حسنہ کی تابندہ مثال ہے۔

حضرت بلالؓ السابقون الاولون میں سے ہیں۔ وہ حبش کے رہنے والے تھے۔ جسم دبلا پتلا تھا۔ مشک فام تھے مگر دل ایمان اور تربیت نبوی کی وجہ سے آفتاب و ماہتاب سے بھی زیادہ روشن و تاباں تھا۔

حضرت عروہ بن زبیرؓ کا بیان ہے کہ وہ بنی جمحہ کی ایک عورت کے غلام تھے۔ امیہ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں حضرت بلالؓ کو لے کر نکلتا اور مکے کی پتھریلی زمین پر ان کو پیٹھ کے بل لٹا دیتا۔ پھر حکم دیتا کہ ایک بڑا سا جلتا ہوا پتھر ان کے سینے پر رکھ دیا جائے۔ جب پتھر رکھ دیا جاتا تو امیہ غرور و نخوت کے ساتھ کہتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کردو اور لات و عزیٰ کی پرستش اختیار کرو۔ مگر حضرت بلالؓ کی استقامت میں کوئی

تزلزل پیدا نہ ہوتا۔

حضرت مجاہدؒ کی زبان سے اس المناک داستان کے کچھ اور حصے پیش ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مشرکین مکہ ان کے گلے میں رسی ڈال کر مکے کی دونوں پہاڑیوں کے درمیان کھینچے کھینچے پھرتے تھے۔ لڑکے انھیں مکے کی گلیوں میں چکر دیتے تھے۔ ظلم و ستم کا یہ پہاڑ ان پر صرف اس لیے توڑا جاتا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتے تھے۔ کفار نہیں سمجھتے تھے کہ یہ ایمان تربیت نبوی کی وجہ سے انھیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ ان کے دل میں توحید صرف عقیدے کی حیثیت سے جاگزیں نہیں تھی' بلکہ ایک ایسے محکم یقین کی صورت میں پیوست تھی کہ اسے تیر ستم' دار و رسن' لوہے کی گرم سلاخیں' جلتے پتھر اور نیزوں کی نوک بھی ان کے دل سے نہیں نکال سکی۔ وہ جبر و استبداد کے ترکش سے نکلنے والے ہر تیر کے جواب میں اللہ احد' اللہ احد ہی کہتے اور اپنے لہو سے اللہ کی وحدانیت کے انمٹ نقوش ریت پر ثبت کرتے جاتے۔ ان کو کسی طاقت کا ڈر تھا نہ خوف۔ اپنی جان کی پروا تھی نہ غربت کا ملال۔ اگر طلب تھی تو بس اللہ کی رضا کی۔ ان کا کردار تھا تو ایسا کہ شمشیر ستم ٹوٹ سکتی تھی' مگر عقیدۂ توحید میں تبدیلی ناممکن تھی۔ دنیا چھوٹ سکتی تھی مگر دامان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں چھوٹ سکتا تھا۔ یہ تھی اعلا کردار کی وہ تربیت جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی۔ حضرت عمرؓ انھیں اپنا آقا کہتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے انھیں آزاد کرایا تھا' مگر ان کا احترام کرتے تھے۔

راہ حق میں جاں نثاری اور بے نظیر شجاعت کی وہ مثال بھی دیکھیے جو حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ نے پیش کی۔ جنگ احد کے موقع پر حضرت جبیر بن مطعم بن عدیؓ جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے' نے اپنے غلام وحشی بن حرب سے کہا کہ اگر تو میرے چچا کے بدلے حضرت حمزہؓ کو قتل کردے تو میں تجھے آزاد کردوں گا۔ حضرت حمزہؓ جب سباع بن عبدالعزیٰ کافر کو جہنم واصل کرچکے تو اس وقت تک وہ زخموں سے چور ہوچکے تھے۔ زخموں کی تکلیف کی وجہ سے جیسے ہی حضرت حمزہؓ کی پشت زمین پر لگی تو وحشی غلام نے ان پر چھپ کر نیزے سے حملہ کردیا اور وہ شہید ہوگئے۔ دیکھیے اللہ کے رسولؐ کا یہ شیر میدان جنگ میں کس انداز سے بڑھا تھا۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ان

کے ہاتھ میں تلوار تھی' دل شوق شہادت سے لبریز تھا' لبوں پر یہ الفاظ تھے کہ میں اللہ کے رسولؐ کا شیر ہوں' اے اللہ تو پاک ہے اس چیز سے جس سے ابوسفیان وغیرہ تجھے منسوب کرتے ہیں' میں مسلمانوں کی شکست پر تجھ سے عذر خواہ ہوں۔ جسم زمین پر تھا' لہو کا فوارہ زخموں سے جاری تھا' مگر مسلمانوں کی شکست کا سبب گناہ کو قرار دے کر اللہ کی بارگاہ میں عذر خواہی کر رہے تھے۔ یہ عجز و انکسار کس کی تربیت کا نتیجہ تھا؟ وہ ایمان کے کتنے بلند مقام پر تھے کہ تیروں اور نیزوں سے چھدے ہوئے جسم کے باوجود ان کا ہر موے تن پکار رہا تھا کہ اللہ تو پاک ہے' تیرا کوئی شریک نہیں۔ یہ مبارک الفاظ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنے تو ان کے پاس پہنچے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی پیشانی کو دیکھ کر چشم پر آب ہوگئے اور آپؐ کے ایما پر ایک انصاری نے حضرت حمزہؓ پر ایک کپڑا ڈال دیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک شہیدوں کے سردار حضرت حمزہؓ ہوں گے۔

یہ وہ شہادت تھی جس پر چشم رسالت اشک بار تھی۔ یہ وہ جاں باز شہید تھے کہ قیامت تک راہ حق میں شہید ہونے والے جنت میں ان کی قیادت میں داخل ہوں گے کیوں کہ رسالت مابؐ کی زبان معجز بیان نے فرمایا کہ وہ اللہ کے نزدیک سید الشہدا ہیں۔

جسم !تیروں سے چھلنی ہوجائے یا اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے جائیں' مگر روح اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت میں سرشار رہے اور اس جاں نثاری کے باوجود عجز و نیاز کے ساتھ اس کی بارگاہ میں عفو و درگزر کی درخواست پیش کرتی رہے۔ اخلاق و اعمال کی یہ بلندی اس بے مثال تربیت کا مظہر تھی کہ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی۔

اللہ تعالیٰ سے محبت' اس کے احکام کی اطاعت اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت نے صحابۂ کرامؓ کو اعمال و اخلاق کی جو پاکیزگی عطا کی اور ان میں اخروی زندگی کی برتری کا جو ایمان راسخ پیدا کیا تھا وہ کبھی شوق شہادت اور جاں بازی کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا اور کبھی ایسی سپردگی کی صورت میں جس کی مثال نہیں ملتی۔

حضرت خالد بن ولیدؓ کو تو دنیا جانتی ہے کہ وہ سیف اللہ کے لقب سے نوازے گئے تھے۔ اس مرتبۂ بلند تک وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی جس کامل اطاعت کے بعد پہنچے وہ

بھی دیکھیے۔ حضرت خالدؓ کے والد نے قبیلۂ بنو ثقیف کو سود پر بہت سے روپے دے رکھے تھے۔ ان کی وفات کے بعد حضرت خالدؓ نے سود کا تقاضا کیا۔ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی :

یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ و ذروا ما بقی
من الربٰوا ان کنتم مومنین (البقرہ : ۲۷۸)

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' خدا سے ڈرو اور جو کچھ
تمھارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو)

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خالد! اب تم صرف راس المال لے سکتے ہو۔" حضرت خالدؓ نے سود کا تقاضا چھوڑ دیا اور اطاعت اور سپردگی کی ایک مثال قائم کردی۔

غزوۂ موتہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کی ایمانی بصیرت اور حربی مہارت کی وجہ سے لشکرِ اسلام کو انتشار اور تباہی سے بچایا۔ یہ وہ غزوہ تھا جس میں حضرت جعفر بن ابی طالبؓ' زید بن حارثہؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ جیسے اہم صحابہ عسکر اسلام کی قیادت کرکے یکے بعد دیگرے جام شہادت نوش کرچکے تھے۔ ایسے نازک موقع پر مسلمانوں نے حضرت خالدؓ کو اپنا امیر عسکر منتخب کیا۔ نگاہ نبوت مدینہ طیبہ سے یہ سارے مناظر دیکھ رہی تھی۔ جب حضرت خالدؓ نے جھنڈا ہاتھ میں لیا تو آپؐ نے فرمایا "اے اللہ وہ تیری تلواروں میں سے ایک تلوار ہے' تو ہی اس کی مدد فرما۔" اور بلاشبہ وہ سیف اللہ ثابت ہوئے۔ کوئی دشمن اسلام سامنے آکر نہ بچ سکا اور جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ یہ شجاعت اور جاں بازی اس لیے نہ تھی کہ انھیں شجاع یا بہادر کہا جائے' بلکہ شوق شہادت اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے تھی۔ وفات کے وقت ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور ان کے لبوں پر یہ الفاظ تھے۔ "میں ایک سو سے زائد جنگوں میں لڑا ہوں' میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جہاں تلوار' تیر یا نیزے کے زخم کے نشان نہ ہوں۔ میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں میدان جنگ میں شہادت حاصل کرتا' لیکن افسوس میں بستر پر پڑا ہوں۔ اس طرح جان دے رہا ہوں جس طرح اونٹ جان دیتا ہے۔" اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی درس گاہ میں تربیت حاصل کرنے والے صحابہؓ کی نظر میں زندگی

کے محبوب لمحات کا کیا تصور تھا وہ حضرت خالدؓ کی زبان سے سنیے ۔ فرماتے ہیں :

"روے زمین پر میرے لیے اس رات سے بڑھ کر کوئی ایسی محبوب رات نہیں گزری جس میں پانی کو یخ بنادینے والی سردی پڑ رہی تھی، میں مہاجرین کی ایک جماعت میں تھا اور صبح کو دشمنوں سے مڈ بھیڑ ہونے والی تھی۔"

مطلب یہ ہوا کہ خون منجمد کردینے والی سردی میں ٹھٹر کر جہاد کے انتظار میں گزاری جانے والی رات زندگی کی بیش قیمت رات تھی۔ اسلام کے جاں باز مجاہد کو جس بارگاہ نبوی سے سیف اللہ کا لقب مل چکا ہو اور جس کے نام سے دشمنان اسلام لرزہ براندام رہتے ہوں، اسے مغرور ہونا چاہیے تھا اور اپنی مقبولیت اور شہرت کو ایک قیمتی متاع تصور کرنا چاہیے تھا، لیکن نہیں! تربیت نبوی نے یہ بات ذہن نشین کرادی تھی کہ ہر چھوٹے بڑے عمل کا فیصلہ قیامت میں ہوگا اور وہی کام یاب ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو۔ جس کے میزان عمل میں اخلاق حسنہ کا وزن زیادہ ہو۔ حضرتِ خالدؓ کے محاسن اخلاق اور ان کی عجز و انکساری کا یہ عالم تھا کہ بہ روایت ابن سعد وفات کے وقت فرماتے تھے " افسوس! میرے نامۂ اعمال میں سوائے **لا اللہ الا اللہ محمدُ الرسول اللہ** کے اور کچھ بھی نہیں۔"

تاریخ کی آنکھوں نے حسن سیرت و کردار کے ایسے درخشاں ستارے صرف درس گاہ نبوی ہی کے افق پر دیکھے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو ان کی ایمانی قوت اور ان کے حسن اخلاق کی اس دولت کا وارث بنائے تاکہ ہم دنیا میں شرک اور ظاہر و باطن کی نجاستوں سے پاک معاشرہ قائم کرسکیں اور اس نظام کی روشنی میں زندگی گزار سکیں جو رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم پر دائمی ہدایت اور قرآن کی صورت میں نازل ہوا۔

اللہ ہمیں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام و مرتبے کا شعور عطا فرمائے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ

اسلاف کے کارناموں اور کردار سے جو قومیں صرف نظر کرتی ہیں وہ اپنے کو کتنا ہی زمانہ شناس اور حقیقت پسند سمجھیں، لیکن وہ ترقی اور پیش رفت کی اہل نہیں ہوتیں۔ آگے بڑھنے کے لیے پیچھے دیکھنا ضروری ہے۔ ماضی کے بغیر حال کا عرفان حاصل نہیں ہوسکتا اور ماضی و حال کی ہم آہنگی کے بغیر مستقبل کی راہیں صاف نظر نہیں آتیں۔ ماضی سے رشتہ استوار رکھ کر ہی حال و مستقبل کو پائدار بنیادوں پر استوار کیا جاسکتا ہے۔

سرکار دو عالم، ہادی برحق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے بعد صحابۂ کرامؓ کا نمونۂ زندگی ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ خصوصاً خلفاے راشدینؓ کی پاک زندگیاں اور کارنامے ہمارے لیے روشنی کا مینار ہیں۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ذات بھی ہمارے لیے بہترین مثال ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انتہائی نامساعد حالات میں داعی اسلامؐ کا ساتھ دیا اور آپؐ کے دست و بازو بنے۔ آپؐ کے بعد اس سے بھی زیادہ ناموافق حالات میں انھوں نے مسلمانوں کی قیادت کی ذمے داریاں سنبھالیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنے دور خلافت میں ایسے سخت و نازک حالات پیش آئے کہ جن کا مقابلہ اس بے نظیر قوت ایمانی کے بغیر ممکن نہ تھا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تربیت گاہ نبوی سے حاصل ہوئی تھی۔ ان کے بے مثال تدبر نے ایسے وقت میں امت کی دست گیری اور رہنمائی کی جب وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بوکھلا گئی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا جری اور دانش مند بھی پریشان و متذبذب تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت اسامہؓ کی سربراہی میں لشکر بھیجنے کے موقع پر جس بے مثال جذبۂ اطاعت رسولﷺ کا مظاہرہ فرمایا وہ صرف ان ہی کا حصہ تھا۔ یہ ایسا سخت وقت تھا کہ بڑے بڑے صحابۂ کرامؓ تک اس معاملے میں مذبذب تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے منکرین زکوٰۃ اور عرب کے نو مسلم قبائل کے ارتداد کے نتیجے میں پیش آنے والے مسائل کو اپنی مومنانہ فراست سے بہ خوبی سلجھا دیا۔ یہ کارنامہ اور ایسے ہی بے شمار کارنامے حضرت ابوبکرؓ کی بے مثال عزیمت پر دلالت کرتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، صحابۂ کرامؓ کا بے مثال کردار ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ ہم پاکستانی اس وقت اپنی مختصر قومی زندگی کے جن سنگین حالات و مسائل سے دوچار ہیں ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہمیں روشنی درکار ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حیات پاک اور ان کا عہد حکومت ہمیں بہترین روشنی فراہم کر سکتا ہے۔ صرف ایمانی بصیرت اور مومنانہ فراست کی ضرورت ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی سیرت ہماری بہترین رہنمائی کرتی ہے اور ہم اس رہنمائی کے محتاج ہیں۔

حضرت عمر فاروق رض

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ و رضوانا (الفتح : ۲۹)

(محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں' اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انھیں رکوع و سجود' اور اللہ کے فضل اور اس کی خوش نودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے)

قرآن حکیم کی اس آیۂ کریمہ میں مسلمانوں کے جن خاص اوصاف کا ذکر آیا ہے وہ ہیں کفار پر سختی' باہم محبت و مودت اور اللہ کی رضا جوئی' نیز اس کی بارگاہ میں رکوع و سجود۔ سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سیرت انھی اوصاف حسنہ کی ایک مکمل تفسیر تھی۔

وہ رزم حق و باطل میں اگر فولاد تھے تو حلقۂ مومنین میں ابریشم کی طرح نرم بھی تھے۔ ان کی شخصیت بہ یک وقت سخت گیری اور رقت و نرمی دونوں کی مظہر تھی۔

حضرت عمر فاروقؓ جب اسلام سے مشرف نہیں ہوئے تھے تو اپنے بہنوئی کے مسلمان ہوجانے کی اطلاع پر انھوں نے ان کے ساتھ جو سختی کی وہ ان کے اصولی مزاج کا ایک رخ تھا' لیکن اپنے شوہر کو بچانے کے لیے حضرت عمرؓ کی بہن جب سینہ سپر ہوئیں تو اپنے بہنوئی کے چہرے سے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر حضرت عمر فاروقؓ کا آب دیدہ ہوجانا اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ ان کے مزاج میں صرف شدت ہی نہیں تھی بلکہ انتہا درجے کی رقت بھی تھی۔ حلقۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد مزاج کی یہی اصولی کیفیات اطاعت الٰہی کے سانچے میں ڈھل گئیں۔ ان کا غیظ و غضب اسلام

کے تابع ہوگیا تھا۔ اب ان کی نرم خوئی کو دیکھیے تو وہ اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ کم زور اور ستم رسیدہ اشخاص کی حمایت اور ہمدردی میں پیش پیش رہنے لگے تھے۔ بے کسوں کی امداد و اعانت اور مظلوموں کی دست گیری ان کی سرشت کا طرۂ امتیاز بن گئی تھی۔ کسی مستحق کو اگر راحت نہ پہنچا سکتے تو اپنی اس محرومی پر متاسف اور پہروں اشک بار رہتے تھے۔

جاہلیت میں حضرت عمر فاروقؓ کی آنکھیں کبھی نم ہوئی ہوں یا نہ ہوئی ہوں، لیکن اسلام سے مشرف ہونے کے بعد امت مسلمہ کی کسی مصیبت پر، عام انسانوں کی تکلیف پر، کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پر مشقت زمانے کو یاد کرکے ایسا گریۂ بے اختیار ان پر طاری ہوتا کہ دیکھنے والوں کے بھی دل پاش پاش ہوجاتے۔

قحط کے زمانے میں حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے صاحب زادے کو خربوزہ کھاتے دیکھا تو ان کی انسان نوازی کو جوش آگیا۔ فرمایا کہ میرے بیٹے! اللہ سے ڈرو۔ امت مسلمہ قحط میں گرفتار ہے اور تم پھل سے لطف اندوز ہو رہے ہو۔ میں قیامت میں اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا اور تم کیا جواب دو گے؟

مطالعۂ تاریخ و سوانح ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کی شخصیت کے رعب اور ان کے دبدبے کا یہ عالم تھا کہ عرب و عجم دونوں پر ان کے نام سے لرزہ طاری ہوجاتا تھا۔ کفار پر سختی ان کا مزاج بن گیا تھا۔ انسانیت سوزی سے ان کا مزاج برہم ہوجاتا تھا۔ بے اصولی ان کو گوارا نہ تھی۔ اس سلسلے میں ہر سختی ان کے لیے روا تھی۔ دوسری طرف دیکھو تو ان کا یہ حال تھا کہ جب وہ مسلمانوں کے خلیفہ تھے تو خود اپنے کو مخاطب کرکے یہ فرمایا کرتے تھے کہ:

خطاب کے بیٹے! تو امیرالمومنین بنا پھرتا ہے۔

ابن خطاب! ہوش کی دوا کر۔

ان کی کسر نفسی کا یہ عالم تھا کہ سامنے کا پڑا ہوا تنکا اٹھا کر فرماتے:

عمر! کاش تو یہ تنکا ہوتا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کو نہ اقتدار مطلوب تھا نہ اپنی ذاتی اور شخصی عظمت سے انھیں دل چسپی تھی۔ ان کی زندگی احکام الٰہی اور سنت نبوی کے محور میں

گردش کرتی تھی۔ کسی چیز کے رد و قبول میں ان کی اپنی ذاتی خواہش کو کوئی دخل نہیں تھا۔

ابن الجوزی نے ان کی سیرت و شخصیت کی اس منفرد خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کو اسلام کی توفیق قرآن پڑھ کر یا سن کر ہوئی تھی۔ اس بات نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے قلبی تعلق کو شدید کردیا تھا۔

قرآن سے ان کے تعلق کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی انتہائی خفگی کے عالم میں بھی ان کے سامنے قرآن کی آیت پڑھ دیتا تو ان کا غصہ فوراً فرو ہوجاتا۔

اپنے زمانۂ خلافت میں ایک مرتبہ رات کو گشت کرتے ہوئے انھوں نے چھپ کر ایک شخص کو شراب پیتے ہوئے دیکھ لیا۔ صبح اس کو اپنے ہاں سزا دینے کے لیے بلوایا اور فرمایا کہ کل رات میں نے گشت کے دوران تم کو شراب پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس شخص نے کہا کہ امیرالمومنین! آپ نے تجسّس کیا اور قرآن کریم نے تجسّس کی ممانعت کی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ خاموش ہوگئے اور سر جھکا کر فرمایا : جاؤ۔

ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات طیبہ' خلفائے راشدینؓ کی تمام زندگی اور صحابۂ کرامؓ کے شب و روز احکام قرآن کے تابع تھے۔ امت مسلمہ کے لیے کل بھی یہی صراط مستقیم تھی اور آج بھی اس کے لیے یہی سیدھا راستہ ہے۔ یہی اقوامِ عالم میں ہمارا امتیاز ہوسکتا ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمارے ان خلفائے راشدین میں ہیں جن کی شخصیت اور کارناموں نے تاریخ عالم پر گہرے نقوش ثبت کیے۔ ان کا دور خلافت ایسے مسائل ملی اور معاملات داخلی سے عبارت تھا جن کا تجربہ امت مسلمہ کو اس سے قبل نہیں ہوا تھا۔ اس پر آشوب دور میں یہودیوں اور مجوسیوں کی سازشیں اور داخلی کش مکش اپنے عروج پر تھی۔ حضرت عثمان غنیؓ نے نہایت تدبر کے ساتھ تمام پیش آمدہ حالات کا مقابلہ کیا اور اسلامی ریاست کی حدود کو وسعتیں دے کر اسے ایک عظیم الشان حکومت کے مرتبے و مقام تک پہنچادیا۔

حضرت عثمانؓ کا شمار السابقون الاولون، عشرۂ مبشرہ اور ان اچھے اکابر صحابہؓ میں ہوتا ہے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر راضی اور خوش رہے۔

حضرت عثمانؓ دولت مند بھی تھے اور غنی بھی۔ بہ ایں ہمہ ان کی ساری زندگی محنت و مشقت سے عبارت رہی۔ ہمدردی، ایثار اور قربانی ان کا شعار تھا۔ وہ فیاض تھے اور سخاوت ان کا مزاج و کردار تھا۔ ان کی دولت علم و حکمت کی راہوں میں اور اسلام کی خدمت میں صرف ہوئی۔ ہم ان کو غزوات میں بھی دیکھتے ہیں اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت عثمان حبشہ ادور دوسری بار مدینے کی طرف ہجرت کی فضیلت کے بھی حامل ہیں۔ حق یہ ہے کہ دولت جب عبادت بن جاتی ہے تو انسان آفاقی رفعتوں کو چھو لیتا ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ تمام صحابۂ کرامؓ کی نظروں میں محترم تھے۔ ان کی سیاسی بصیرت ہمہ جہت اور ہمہ دم تدبر و تفکر کا عنوان تھی اور ان کی سفارت کاری کی اہلیت و قابلیت کے لیے تو یہی ثبوت کافی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالقعدہ

۶ ہجری میں اہل مکہ کی طرف حضرت عثمانؓ کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ اسی کے نتیجے میں بیعت رضوان اور صلح حدیبیہ کے واقعات ظہور پذیر ہوئے۔

حضرت عثمان غنیؓ حد درجہ صاحب ہمت تھے۔ ان کے دور کی فتوحات ان کی اولوالعزمی کی مظہر ہیں۔ کارناموں میں حضرت عثمانؓ کا یہ اہم اور ممتاز کارنامہ ہے کہ ان کے عہد میں دنیا کے نصف حصے میں اسلام کا پرچم پوری شان و شوکت سے لہرانے لگا تھا۔ اس دور کی مہذب و متمدن دنیا کے آدھے سے زیادہ مراکز پر حضرت عثمانؓ کو فتح حاصل تھی۔ ہمیں فتوحات عثمانی کا جائزہ لیتے ہوئے چند حقائق پر بھی غور کرنا چاہیے۔ نقطۂ فکر یہ ہے کہ جب انھیں ہم فاتح کہتے ہیں تو کیا فتح و تسخیر کو ان کی مکمل سیرت و شخصیت کا ایک جزو قرار دیتے ہیں یا ان کی سیاسی بصیرت' انتظامی قابلیت' عسکری مہارت اور مملکت کے نظم و نسق پر ان کی مکمل گرفت کا مظہر بھی سمجھتے ہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ اندرونی نظم و نسق کے استحکام' پوری امت کی تائید و حمایت اور حضرت عثمانؓ کے اصولی مزاج اور ذاتی قابلیت کے بغیر اتنی عظیم الشان فتوحات ممکن ہی نہیں تھیں۔ فتوحات عثمانی پر غور کرنے کا ایک نہایت اہم اور صحت مند زاویہ یہ ہے کہ کیا فتوحات کو ہم صرف ایک عسکری اقدام سمجھتے ہیں یا اسے اشاعت اسلام اور ترویج علم و حکمت کے تصور سے بھی وابستہ کرتے ہیں؟ صورت حال یہ ہے کہ فتوحات کے محدود مفہوم کی وجہ سے حضرت عثمانؓ کی پر عظمت سیرت کے بہت سے اہم گوشے نگاہوں کے سامنے نہیں آسکے۔ اس حیثیت سے ہمیں ان کی شخصیت کا یہ جائزہ ملتا ہے کہ ان کی ذات سے اسلام کی جو اشاعت ہوئی ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مغرب' مشرق وسطیٰ اور خصوصیت کے ساتھ چین' حضرت عثمانؓ ہی کے عہد میں اسلامی تہذیب و تمدن کے نقوش سے متعارف ہوا۔ بحری بیڑے کی تشکیل صرف علم کا نہیں بلکہ فنی مہارت یعنی ٹکنالوجی کا بھی عنوان ہے۔ اس حیثیت سے خلیفۂ ثالثؓ کا مقام تاریخ میں بہت بلند نظر آتا ہے کہ انھوں نے صرف ممالک ہی فتح نہیں کیے بلکہ ان پر تہذیبی' علمی اور ذہنی فتح بھی حاصل کی۔ سیاسی بصیرت' تدبر اور حکمت کی یہی وہ معراج ہے کہ جو ایک مسلمان سیاست داں کے لیے وجہ بصیرت ہونی چاہیے۔

حضرت عثمانؓ کی فتوحات کے منطقی نتائج میں وہ اقتصادی خوش حالی بھی ہے جس کی

طرف ابن الاثیر نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی خلیفۂ ثالثؓ کا عہد اقتصادی اعتبار سے خوش حالی کا عہد تھا۔ عام زندگی میں خوش حالی کے مظاہر نمایاں تھے اور آسائشیں عام ہونے لگی تھیں۔

حضرت عثمان غنیؓ کی عظمت اور رفعت پر یہ حقیقت گواہ ہے کہ انھوں نے ان فتنہ ہائے یہود اور شورش ہائے مجوس کے باوجود اشاعت اسلام، استحکام مملکت، ترویج علم و حکمت اور تسخیر ممالک کا سلسلہ نہایت اخلاق و اخلاص اور ایثار کے ساتھ جاری رکھا اور لاریب غلبۂ اسلام ہی کے لیے انھوں نے اپنی جان راہ حق میں قربان کردی۔ تاریخ ان پر نازاں ہے اور رہے گی۔

حضرت علیؓ

حضرت علیؓ جیسی طاہر و طیب شخصیت کا اظہار کسی محدود نظریے سے نہیں ہو سکتا' اس کے لیے نظر کی ضرورت ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں تو ہماری مراد معقول بنیادوں پر استوار نظریات کی قدر و قیمت گھٹانا نہیں ہوتی' بلکہ ہمارا مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا ہوتا ہے کہ نظریے کی اپنی حدود ہوتی ہیں۔ کوئی بھی نظریہ خواہ وہ کتنا ہی محکم کیوں نہ ہو اس میں وہ استحکام تلاش کرنا بے سود ہے جو صرف اور صرف اعجاز نظر کا کارنامہ ہوتا ہے۔ اپنے سے کئی گنا طاقت ور اور پختہ کار پہلوان سے بے دھڑک نبرد آزما ہو جانا نظریے کی نہیں نظر کی کرامت ہے۔ نظریہ اپنی نوعیت میں ظاہری سود و زیاں کے پیشِ نظر فیصلوں پر زور دیتا ہے۔ دشمنوں کے نرغے میں کسی ایسے بستر پر آرام و سکون سے سو جانا جس کے چاروں طرف موت منڈلا رہی ہو' نہ ظاہری عقل کا تقاضہ ہے اور نہ کسی نظریے کا کرشمہ۔ اسے ہم صرف فیضان نظر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ فیضان نظر بھی کس کا؟ جس پر تمام اسرار الٰہی اور رموز کائنات سورج کی طرح روشن ہوں۔ جو اپنی ذات میں سراج منیرؐ ہو۔ حضرت علیؓ کی پوری زندگی اسی سراج منیرؐ سے روشن ہو کر ہر طرف یقین و ایمان کی روشنی بکھیرتی نظر آتی ہے۔

ہر چند کہ حضور نبی کریمؐ کے فیضان نظر کی ایک جہت عمومی بھی ہے اور رحمتہُ اللعالمین کی حیثیت سے آپؐ کی نظر کرم پوری مخلوق پر پھیلی ہوئی ہے' لیکن تاریخ شاہد ہے کہ حضورؐ کا فیضان نظر جس قدر حضرت علیؓ کو حاصل رہا وہ کسی دوسرے کو میسر نہ آسکا۔ اس کا سبب وہ مخصوص گھریلو حالات اور حضورؐ سے وہ خونی رشتہ تھا جس سے حضرت علیؓ کو یہ موقع فراہم ہوا کہ وہ بچپن ہی سے حضورؐ کے زیر سایہ رہے اور حضورؐ کے نمونے پر خود کو ڈھالنا اپنا شعار بنایا۔ جس طرح کوئی بچہ اپنے ماں باپ اور استاد

کے اثرات قبول کر کے ان کی شخصیتوں کو اپنے لیے مثال بنالیتا ہے بالکل اسی طرح حضرت علیؓ نے حضورؐ کی شخصیت کو اپنے لیے مثال بنالیا تھا۔ حضورؐ نے ان کی تربیت ایک باپ کی طرح کی تھی۔ چناں چہ حضورؐ کی شخصیت کے اثرات حضرت علیؓ کے قلب و ذہن پر تمام عمر مرتسم رہے۔ اخلاق و عادات' معاملات و عبادات غرض زندگی کے ہر شعبے میں حضورؐ کے اسلوب حیات کی جھلکیاں حضرت علیؓ کی عملی زندگی میں بہت نمایاں تھیں۔ یہ حضورؐ ہی کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ حضرت علیؓ بچپن ہی سے بت پرستی کی خرابیوں سے دور رہے اور حضورؐ کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ہر طرح کی چھوٹی بڑی معاشرتی برائیوں سے بھی بچے رہے۔ اس طرح ان کے دامن پر خرابی کا کوئی داغ نہ لگ سکا۔ حضرت علیؓ کی طہارت نفس اور پاکیزگی کردار کے بارے میں حضور نے بھی گواہی دی ہے۔ ترمذی شریف میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ مدینے میں جب رسول اللہؐ نے برادری قائم کی تو حضرت علیؓ نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا کہ "یا رسول اللہؐ! آپؐ نے تمام صحابہؓ میں مواخات قائم کردی ہے' لیکن میرا کسی سے بھائی چارے کا رشتہ نہیں جوڑا۔" اس پر حضورؐ نے فرمایا "دنیا و آخرت میں تم میرے بھائی ہو۔" یہ ایسی فضیلتیں ہیں جو صرف حضرت علیؓ سے مختص ہیں۔

حضور نبی کریمؐ کی تربیت نے حضرت علیؓ کے کردار میں جو صلاحتیں پیدا کی تھیں ان کا اظہار حضرت علیؓ کی عملی زندگی میں برابر ہوتا رہا۔ بہادری اور شجاعت ان کی پہچان تھی۔ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں وہ حضورؐ کے ساتھ رہے اور میدانِ کارزار میں نہایت نمایاں کارنامے انجام دیے۔ شجاعت و بہادری سے قطع نظر ذہانت و بصیرت میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھے۔ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو جس آسانی سے حل کر دیتے تھے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس ضمن میں ایک واقعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

حضور نبی کریمؐ نے حضرت علیؓ کو نوجوانی کی عمر میں یمن کا قاضی بنایا تو حضرت علیؓ نے کہا "یا رسول اللہؐ! آپؐ مجھ نوجوان کو قاضی بنا رہے ہیں۔ حال آنکہ مجھے فیصلے کرنے کے طریقے بالکل معلوم نہیں ہیں۔" اس پر حضور نبی کریمؐ نے حضرت علیؓ کا سینہ تھپ تھپایا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی "اے اللہ! اس کے قلب کو روشن کردے۔ اس

کی زبان میں تاثیر دے دے۔" حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس دعا کے بعد مجھے کبھی کسی مقدمے کے فیصلے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

ان کے فیصلوں کے بارے میں حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ "حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ ہم سب میں علیؓ بہترین فیصلے کرتے ہیں۔" حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ باہم کہا کرتے تھے کہ مدینے والوں میں سب سے اچھا فیصلہ حضرت علیؓ کرتے ہیں۔ بات دراصل یہی ہے کہ حضرت علیؓ کی فیصلہ کرنے کی صلاحیت حضورؐ کے فیضان نظر کا ثمرہ تھی۔

حضرت علیؓ کے فضائل بے شمار ہیں۔ وہ ان دس صحابہؓ میں شامل ہیں جن کو زندگی ہی میں حضورؐ نے جنت کی بشارت دے دی تھی۔ حضورؐ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "جس کا میں مولا ہوں اس کے علی مولا ہیں۔" اب آپ مولا کے کوئی بھی مروج معنی لے لیں۔ اس سے حضورؐ کے حضرت علیؓ سے گہرے تعلق کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ یہ مشہور حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔" ظاہر ہے کہ اس مقام و مرتبے کا وہی شخص مستحق ہوسکتا تھا جس کی تعلیم و تربیت آغوشِ رسالت میں ہوئی ہو۔

بچپن ہی سے حضورؐ کے زیر سایہ رہنے کی وجہ سے سیرت رسولؐ ان کی فطرت میں سما گئی تھی۔ نماز میں ان کا یہ استغراق تھا کہ زہر میں بجھا ہوا تیر نماز کے دوران ان کے جسم مبارک سے کھینچ کر باہر نکالا گیا اور ان کو خبر تک نہ ہوئی۔ یہ رسول پاکؐ کے فیضان نظر کا معجزہ ہی تو تھا۔

حضورؐ نے اپنی چہیتی بیٹی حضرت فاطمہؓ کی شادی حضرت علیؓ سے کی اور اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی اولاد کا سلسلہ انھی سے چلایا۔ اس طرح حضرت علیؓ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے حضورؐ کے روحانی اور جسمانی دونوں سلسلوں کو آگے بڑھایا۔ روحانی سلسلوں کے بارے میں یہ ایک حقیقت مسلم ہے کہ تصوف کے چار سلسلے ہیں۔ ان میں سے تین یعنی قادری، چشتی اور سہروردی سلسلے حضرت علیؓ پر ختم ہوتے ہیں۔ چوتھا سلسلہ نقشبندیہ حضرت علیؓ سے ہوتا ہوا حضرت ابوبکرؓ پر ختم ہوتا ہے۔ یوں بھی تصوف کے سلسلے میں حضرت علیؓ کا ارشاد کہ "جس نے خود کو پہچانا اس نے اللہ کو پہچانا" پورے

علم تصوف کی بنیاد ہے۔

علم تصوف کے علاوہ اخلاقیات اور انسانی نفسیات سے متعلق انھوں نے چھوٹے چھوٹے فقروں میں جو حکمت کے خزانے بند کر دیے ہیں ان سے حضرت علیؓ کی بصیرت اور قدرت بیان دونوں کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ مثال کے طور پر حضرت علیؓ کے چند اقوال ملاحظہ ہوں:

- ضرورت سے زیادہ احتیاط اور ہوشیاری کا رویہ دراصل بدگمانی کا نتیجہ ہوتا ہے۔
- توفیق الٰہی بہترین رہبر ہے، خوش اخلاقی بہترین دولت ہے، عقل و شعور بہترین ساتھی ہیں اور ادب بہترین میراث ہے۔
- رنج و مصیبت ایک مقام پر پہنچ کر ختم ہوجاتے ہیں۔ عقل مند کو چاہیے کہ مصیبت کے عالم میں صبر کرے۔
- سب سے بڑی دولت عقل ہے۔
- سب سے بڑا افلاس بے وقوفی ہے۔
- سب سے بڑی وحشت غرور ہے۔
- بے وقوف کی دوستی، جھوٹے کی ہم نوائی، کنجوس کا ساتھ اور فاجر کا قرب ہلاکت کا سبب ہیں۔

حضرت علیؓ کی پوری زندگی ایک آئینہ ہے جس میں سیرت رسول پاکؐ کے خدوخال واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ جسے مجھ سے محبت ہے اسے علیؓ سے محبت ہے۔

اللہ ہمارے سینوں کو حب رسولؐ اور حب علیؓ سے معمور فرمائے۔

حضرت علیؓ بہ حیثیت منتظم

اسلام نے خلیفۃ المسلمین پر جو ذمے داریاں عائد کی ہیں، انھیں پیش نظر رکھتے ہوئے جب ان حالات کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ جن میں چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زمام کار سنبھالا تو اس امر کا اندازہ لگانا دشوار نہیں رہتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کن اعلا انتظامی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔

بار خلافت حضرت علیؓ کے شانوں پر پڑا تو امت انتشار اور اضطراب کی ایک ایسی کیفیت سے دوچار تھی جس کا تجربہ اس نوخیز ملت کے لیے پہلا تجربہ تھا۔ انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے اور اپنے حسن تدبر سے ان فتنوں پر قابو پایا اور اپنی اعلا انتظامی صلاحیتوں سے مملکت میں استحکام پیدا کیا۔

ملکی نظم و نسق کی غیر معمولی اہلیت و صلاحیت کا سب سے بڑا ثبوت اور مظاہرہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ عملاً اس انتظامی مزاج کو بحال کرنا چاہتے تھے کہ جو خلافت راشدہ کا امتیاز تھا۔ اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت سے وہ اس میں کام یاب رہے۔

خلافت راشدہ کے اس دور میں انھوں نے اسلامی ریاست کے منتظم کی حیثیت سے جو کارنامے انجام دیے ان کی تفصیل کے لیے ایک مکمل کتاب کی ضرورت ہے۔ یہاں بعض چیدہ واقعات پیش کیے جاتے ہیں جن سے ان کے حسن انتظام کا اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے یہودیوں کو حجاز سے نکال دیا تھا اور انھیں نجران میں آباد کرادیا تھا۔ جب حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے تو ان یہودیوں نے بڑی منت سماجت کی کہ ان کو پھر اپنے قدیم وطن میں واپس آنے کی اجازت دی جائے۔ حضرت علیؓ نے صاف انکار کردیا اور فرمایا کہ وہ اس فیصلے میں کوئی تبدیلی نہیں کریں گے۔

حضرت علیؓ کی انتظامی خوبی اور ان کی منفرد صلاحیت کا اظہار اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے عمّال کی بڑی سخت نگرانی کرتے تھے۔ انھیں اس بات سے روکتے تھے کہ وہ خود کو سیاہ و سفید کا مالک نہ سمجھنے لگیں۔ اپنی نصائح کے ذریعے سے ان میں زیادہ سے زیادہ خدمت کا جذبہ پیدا کرتے اور کبھی کبھی ان کا احتساب بھی کرتے رہتے تھے۔

حکام کے طرز عمل کی نگرانی اور تحقیقات کے لیے حضرت علیؓ نے حضرت کعب بن مالکؓ کو مقرر کیا تھا اور ان کو تاکید کی تھی کہ عراق کے تمام اضلاع میں جاکر وہ عمال کا حال معلوم کریں اور عوام سے مل کر ان کے طرز عمل کے بارے میں دریافت کریں۔

حضرت علیؓ اپنے عمال کے مالی معاملات پر سخت نگرانی رکھتے اور کسی بھی فروگزاشت پر ان کی بہت سخت گرفت کرتے تھے۔ ایک عامل نے بیت المال سے کچھ رقم بہ طور قرض لی۔ حضرت علیؓ نے کچھ دنوں کے بعد اس رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اس عامل نے درخواست دی کہ یہ رقم بہت معمولی ہے اور اسے اس نے ایک کارخیر میں صرف کیا ہے اس لیے اسے معاف کردیا جائے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ایک حبہ بھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔

انتظامی معاملات میں حضرت علیؓ کی اس سخت گیری سے ان کے اعزہ بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بیت المال سے ایک بڑی رقم لی۔ حضرت علیؓ انھیں اس کی واپسی پر متوجہ کرتے رہے یہاں تک کہ انھیں رقم واپس کرنی پڑی۔

محاصل کے نظام کو حضرت علیؓ نے بہت مضبوط بنایا۔ انھوں نے جنگلات کو ملکی محاصل کے ضمن میں داخل کیا۔

جنگی مصلحتوں کے تحت گھوڑوں کی افزائش کا انتظام ریاستی سطح پر کرنے کا حکم بھی حضرت علیؓ ہی نے دیا اور یہ ان کی دفاعی بصیرت اور انتظامی اہلیت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

انتظامی اعتبار سے شام میں مختلف فوجی چوکیوں اور چھاونیوں کا قیام بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لیے وہاں انھوں نے قلعے بھی بنوائے تھے۔

دریائے فرات کے پل کی تعمیر بھی حضرت علیؓ کا ایک اہم انتظامی کارنامہ ہے۔

سربراہ مملکت کی انتظامی خوبی کا دار و مدار اس بات پر ہوتا ہے کہ عمال، جنھیں آج

کی زبان میں بیوروکریٹس کہتے ہیں' صاف ستھرے کردار کے مالک ہوں۔ وہ قومی خزانے کو اپنی ملکیت اور عوام کو اپنی رعیت نہ سمجھتے ہوں۔ ان کا محاسبہ برابر ہوتا رہتا ہو۔ عوام کی تمدنی ترقی کا عمل جاری رہتا ہو۔ ان کے دفاع اور تحفظ کا مکمل انتظام ہو اور عدل و انصاف انھیں حق کے طور پر حاصل ہوتا ہو۔

یہ ساری خوبیاں عہد خلافت میں موجود تھیں اور حضرت علیؓ نے انھیں زندہ و تابندہ رکھ کر اپنے تدبر اور اپنی اعلا انتظامی صلاحیتوں کا لازوال نقش قائم کیا۔

عہد خلافت کے یہ لازوال نقوش ہماری ہیئت اقتدار کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حضرت علیؓ۔ نمونۂ قول و عمل

یہ دنیا کروڑ ہا سال سے آماج گاہ زندگی ہے۔ اس کرۂ ارض نے ان گنت نشیب و فراز دیکھے اور بے حساب مد و جزر سے اسے واسطہ پڑا۔ انقلابات لیل و نہار کی کوئی گنتی نہیں۔ انسانوں کا کوئی شمار نہیں کہ جنھوں نے فضائے ارض میں گونجنے کے بعد بہ قضائے رب جلیل کوچ کیا۔ کہاں گئے؟ کوئی نہیں جانتا!

انسانوں میں ایک انسان ایسا ہے جس نے کعبۃ اللہ میں آنکھ کھولی اور اسی مقام پر اس کی آنکھیں بند ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ کے گھر سے زندگی کا آغاز ہوا اور اللہ ہی کے گھر میں زندگی اختتام کو پہنچی۔ اس انسان عظیم نے ایک بات کہی' فرمایا:

"حیات ابدی کا مستحق وہ ہے جس سے علم کو زندگی ملے۔
جو علم کو زندہ رکھے گا خود بھی زندہ رہے گا۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ آج بھی زندہ ہیں کیوں کہ انھوں نے علم کو زندگی دی تھی اور علم کو زندہ رکھا تھا۔ حیات ابدی کا ہر استحقاق ان کو حاصل ہے۔ علم و حکمت کی روشنیاں اور ضو فشانیاں جن شخصیات حمید و سعید سے عبارت ہیں وہ یقیناً روح فکر علیؓ سے سرشار ہیں اور جب تک وہ علم کو زندہ رکھیں گے سرفراز رہیں گے۔ علم کے باب میں' میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس قول رفیع سے اپنی بات کا آغاز اس لیے کیا ہے کہ ہم نے پاکستان میں سب سے زیادہ جس چیز سے غفلت برتی وہ علم ہے۔ اس ریاست اسلامی میں سب سے زیادہ کمی علم و حکمت کی ہے' حال آنکہ اسلام ہی وہ دین متین ہے جس کی ہر بنیاد قائم بر علم ہے اور جس کی تعلیمات کی ہر اساس اقرا اور فروغ علم و حکمت ہے۔ ہم اس حقیقت سے خوب آگاہ اور واقف ہیں کہ حضرت علیؓ کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ نبی اکرم سرکار دو عالم اور نور مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان

سے بے حد محبت تھی۔ اس محبت بے کراں کا ایک عنوان یہ ہے کہ حضرت علیؓ بابُ العلم تھے۔

لاریب! ہم حضرت علیؓ سے محبت کرتے ہیں۔ ہم ان کا احترام کرتے ہیں' ان کے اکرام کے لیے ہماری ہر جان حاضر ہے۔ اس محبت اور اس احترام و اکرام کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ پاکستان میں ہم علم سے محبت کریں اور عالم کا احترام و اکرام کریں۔

پاکستان میں حالات جہل ایک روح فکر و انقلاب کے متقاضی ہیں۔ ہمیں علم و حکمت کو اپنی اولیتوں میں شمار کرنا چاہیے اور طرز حکومت میں علم و حکمت کو اساس بنانا چاہیے۔

جب ہم اپنے فکر و نظر کی وسعت اور گہرائی و گیرائی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت اجاگر ہوجاتی ہے کہ انسانی زندگی کے نشیب و فراز پر حضرت علیؓ کی نظر بہت گہری تھی۔ ان کے اقوال میں فکر کی عظمت اور عمل کی رفعت کے ساتھ ان کے قیمتی تجربات اور خود ان کی اپنی حیات مبارکہ کی نہایت دل کش تصویریں نظر آتی ہیں۔ ان کے اقوال ان کی فکر و عمل کے بہترین ترجمان ہیں اور یہی خصوصیت حضرت علیؓ کو دنیا کے تمام مفکروں سے ممتاز بناتی ہے۔ حضرت علیؓ کے چند اقوال پیش ہیں:

- علم ایسا وسیع خزانہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوسکتا اور عقل ایسی پوشاک ہے جو کبھی پرانی نہیں ہوتی۔
- جس کے پاس دولت ہو اس کے آس پاس بہت سے دشمن ہوتے ہیں اور جس کے پاس علم ہو اس کے پاس دوست ہی دوست ہوتے ہیں۔
- موت کے معاملے میں بہادر بنو' تم کو زندگی مل جائے گی۔
- منافقت شرک کی بہن اور خیانت جھوٹ کی بہن ہے۔
- غلطی کا اعتراف کرنے سے بزرگی ملتی ہے' پستی نہیں۔
- کارخانۂ قدرت پر غور کرنا بھی عبادت ہے۔
- اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے امید نہ رکھو۔
- سب سے زیادہ اپنے گناہوں سے ڈرو۔

✤ غربت کی زینت خوش اخلاقی ہے اور دولت مندی کا حسن شکر نعمت ہے۔
✤ دوسروں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے نیازی کا نام دولت مندی ہے۔
✤ صبر اور ایمان میں وہ رشتہ ہے جو جسم اور سر میں ہے۔
✤ حرص کا دوسرا نام غلامی ہے۔
✤ اس امت کے بہترین لوگ وہ ہیں دنیا جن کو آخرت سے غافل نہیں کرتی اور آخرت جن کو دنیا سے غافل نہیں کرتی۔

یہ تمام اقوال بہ ظاہر ایک دوسرے سے الگ معلوم ہوتے ہیں' لیکن بہ غور جائزہ لینے کے بعد یہ معلوم ہوگا کہ سب میں فکری وحدت اور معنوی ربط و ہم آہنگی ہے۔ ان تمام اقوال میں عزت نفس' غیرت و خود داری' حرص و طمع سے اجتناب' قناعت' محنت اور سعی و عمل کا موثر ترین درس ملتا ہے اور ایک ایسی زندگی کی طرف رہنمائی حاصل ہوتی ہے جو دین و دنیا کی تفریق سے پاک ہو' جس میں توکل کے ساتھ عمل بھی ہو اور تعمیر حیات کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان کے ساتھ صبر کے ذریعے سے مشکلات زندگانی کو سر کرنے کا عزم بھی ہو۔

ان اقوال میں وہ سارے اشارات موجود ہیں جو افراد ہی نہیں بلکہ اقوام کو بھی دنیا میں معزز بناتے اور انھیں بام عروج تک پہنچاتے ہیں۔

اپنے اجتماعی اور قومی مسائل کا جائزہ لیجیے اور فیصلہ کیجیے کہ موجودہ حالات میں ان سے بہتر رہنما اصول اور کیا ہوسکتے ہیں؟ اب دیکھتے ہیں کہ خود حضرت علیؓ کی عملی زندگی میں ان اقوال کی کتنی روشن مثالیں ملتی ہیں اور ان کا کتنا صاف و شفاف عکس نظر آتا ہے۔

حضرت علیؓ کو اپنے تمام فضائل کے باوجود اپنے ہاتھ سے محنت مزدوری کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہوئی۔ چشم فلک نے یہ بھی دیکھا کہ لوگ ان سے مسائل پوچھنے آتے تو کبھی وہ جوتا گانٹھتے دکھائی دیتے تو کبھی اونٹ چراتے اور کبھی زمین کھودتے ہوئے ملتے۔ مزاج میں سادگی اتنی تھی کہ فرش خاک پر بے تکلف سوجاتے۔ اسی وجہ سے زبان نبویؐ نے ان کو ابو تراب کا لقب دیا۔

حضرت علیؓ خود بیان فرماتے ہیں کہ "مدینے میں ایک دن مزدوری کی تلاش میں دور

تک نکل گیا۔ ایک عورت ملی جس نے ڈھیلے اکھٹے کیے تھے۔ خیال کیا کہ غالباً وہ ان کو بھگونا چاہتی ہے۔ میں نے ہر ڈول پر ایک کھجور کی اجرت طے کی اور سولہ ڈول پانی بھرے جس سے میرے ہاتھوں میں چھالے پڑگئے۔ اس عورت نے مجھے سولہ کھجوریں گن کر دیں۔ میں رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کھجوریں کھائیں۔ میرے ساتھ حضورؐ نے بھی یہ کھجوریں تناول فرمائیں۔"

افلاس و غربت کے باوجود ان کے مزاج میں تنہا خوری نہ تھی۔ سخت بھوک کے باوجود سائل کو سامنے کا کھانا اٹھا کر دے دیا اور خود صابر و شاکر رہے۔ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ "صدقہ دے کر اللہ سے رزق مانگو۔"

حضرت علیؓ کے اسی حسن عمل کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو رزق کی فراوانی بخشی۔ خود فرماتے ہیں کہ:

"آج میرا یہ حال ہے کہ چالیس ہزار سالانہ میری زکوٰۃ کی رقم ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر باندھتا تھا۔"

حضرت علیؓ کے ہاتھوں سے افلاس میں صبر کا دامن کبھی نہیں چھوٹا۔ انھوں نے عزت نفس کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں سرگرم رہے۔ علم حدیث اور علم قرآن کے نکات بتاتے رہے۔ جب رزق میں وسعت ہوئی تو شکر نعمت کے طور پر اپنا مال بے دریغ اللہ کی راہ میں صرف کرتے رہے۔

میں نے حضرت علیؓ کی زندگی کے چند رخ آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں۔ کیا یہ کافی ہے کہ آپ اس پر واہ واہ کرلیں اور سمجھ لیں کہ آپ نے حضرت علیؓ سے محبت و احترام کا حق ادا کردیا یا یہ ضروری ہے کہ ہم پاکستان میں اپنی ناکارہ زندگیوں کو حیاتِ علیؓ سے مماثل کرنے کا فیصلہ کریں؟

عالم اسلام آج عالم شکست خوردگی میں ہے۔ باور کرنا چاہیے کہ یہ شکست و ہزیمت اس لیے مقدر ہوئی کہ تعلیمات قرآن و سنت سے ہم نے فرار اختیار کیا اور خلفائے راشدینؓ کے فکر و نظر سے انحراف کیا۔ درستی حالات کے لیے ہمیں لازماً اپنے مرکز فکر و نظر پر واپس آنا ہوگا۔

اسوۂ علیؓ ہمارے سامنے ہے اور ان کے اقوال بھی ہمیں معلوم ہیں۔ آج عالمِ اسلام اور خصوصاً پاکستان کے حالات میں یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو حضرت علیؓ کے اقوال و اعمال کی کسوٹی پر پرکھیں، ان سے سبق حاصل کریں اور ان پر عمل پیرا ہوں۔ تب ہی ہماری علم و حکمت کی کھوئی ہوئی میراث پھر سے حاصل ہو سکتی ہے اور ہم اس قابل ہو سکتے ہیں کہ علم و حکمت اور فہم و فراست کے میدان میں دوسری اقوام کی رہنمائی کر سکیں۔ یہی ہمارا مقام و مرتبہ ہے جو ہماری غفلت سے ہم سے چھن گیا ہے۔

حضرت علیؓ ۔ معلّم و مجتہد

یہ پہلی صدی ہجری کا واقعہ ہے جب علوم اسلامیہ وحی الٰہی اور ہدایات نبوی کی روشنی میں برق رفتاری کے ساتھ اپنے ارتقا کے مراحل طے کر رہے تھے۔ فقہ و قانون کی تشریح و تعبیر سے ایک وسیع علمی معاشرے کے امتیازی خد و خال نمایاں ہوتے جارہے تھے۔ شعاع اسلام جزیرۃ العرب سے نکل کر حدود عجم میں داخل ہو رہی تھی۔
ابن سعد لکھتے ہیں کہ مسجد کوفہ کے منبر سے ایک آواز آئی :

"کون ہے جو میرا علم ایک درہم میں مجھ سے حاصل کرنا چاہتا ہے؟

الحارث دوڑ کر بازار سے ایک درہم کا کاغذ خرید کر لایا۔ پکارنے والے کے سامنے فرط اشتیاق کے ساتھ بیٹھ گیا۔ علم کی بارش ہوئی۔ وہ سیراب ہوکر اٹھا اور دامنِ قرطاس کثیر علوم کے خزانوں سے بھر گیا۔

یہ معلم حضرت علیؓ تھے اور الحارث ان کے شاگرد تھے۔

اس واقعے سے حضرت علیؓ کی وہ شخصیت نظر آتی ہے جس میں علم کی روشنی سے انسانی معاشرے کو منور کرنے کا ایک ناقابل تسخیر عزم ظاہر ہوتا ہے۔ علم ہی وہ اساس ہے جس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تہذیب و تمدن کو استوار کیا اور جسے صحابۂ کرامؓ نے اپنی اجتہادی فکر و بصیرت سے مستحکم کیا۔

حضرت علیؓ اپنے اجتہاد و استنباط، اخذ نتائج اور احکام قرآن و سنت کی اطلاقی تشریح و تعبیر میں خصوصی مہارت کی وجہ سے نہایت بلند و ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

اسلامی علوم و معارف کا اصل سرچشمہ قرآن پاک ہے۔ حضرت علیؓ اس سرچشمے سے پوری طرح سیراب ہیں اور وہ ان صحابۂ کرامؓ میں ہیں جنھوں نے عہد نبوی ہی میں نہ صرف قرآن کریم حفظ کرلیا تھا، بلکہ ایک ایک آیت کے مفہوم و معنی اور شان نزول

سے بھی پوری طرح واقف تھے۔

ابن سعد نے لکھا ہے کہ ایک موقع پر حضرت علیؓ نے خود فرمایا تھا کہ میں ہر آیت کے متعلق بتا سکتا ہوں کہ یہ کہاں، کیوں اور کس کے حق میں نازل ہوئی۔

اسی مہارت کی وجہ سے حضرت علیؓ کا شمار مفسرین قرآن کے اعلا طبقے میں ہوا اور علوم قرآنی کی تعلیم و تدریس اور ترویج کی عظیم الشان خدمات کی انجام دہی ممکن ہوئی۔

ان کا ایک اہم امتیاز یہ بھی تھا کہ وہ تحریر و کتابت کے فن سے بھی پوری طرح واقف تھے اور کاتبان وحی میں تھے۔ قدرت تحریر اور قرآنی بصیرت کی وجہ سے تعلیم بالقلم یعنی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی ان کی خصوصیات میں سے ہے۔ یعقوبی اور ابنِ ندیم نے ان کے علمی آثار یعنی تصانیف میں ایک ایسی تصنیف کا ذکر کیا ہے جس میں سورتوں کی ترتیب نزول کے اعتبار سے تھی اور قرآن مجید کی تفسیر مختلف پہلوؤں کے ساتھ بیان کی گئی تھی۔

حضرت علیؓ بچپن سے لے کر وفات نبویؐ تک مکمل تیس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے۔ اس لیے احادیث اور سنن نبویؐ کے بھی نہایت بلند پایہ عالم تھے۔ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد فرامین اور مکتوبات کے لکھنے کا شرف حاصل تھا۔ قرب خاص کی وجہ سے منشائے نبویؐ سے متعلق کی ہوئی ان کی تشریحات کو استناد حاصل تھا۔ وہ خلافت راشدہ کے آغاز سے لے کر خود اپنے عہد تک علم حدیث کی نشر و اشاعت میں مصروف رہے۔ حضرت علیؓ سے ۵۸۶ احادیث مروی ہیں۔ وہ اپنے شاگردوں کو احادیث لکھواتے بھی تھے۔ الطبرانی اور المستدرک میں ان کی تمام روایات یک جا ہیں۔ ان روایات کے مطالعے سے علم حدیث کی تاریخ میں ان کے بلند مقام و مرتبے کا اظہار ہوتا ہے۔

قرآن و سنت میں حضرت علیؓ کی اجتہادی بصیرت کا اندازہ ان کے فتاویٰ اور ان کے عدالتی فیصلوں سے ہوتا ہے۔ یہ فتوے اور فیصلے انھوں نے بہ حیثیت قاضی صادر کیے اور ان کی قانونی گہرائیوں کی وضاحت کرکے عدلیہ کے لیے نظیر بنا دیا۔

محدث ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ یمن میں حضرت علیؓ نے دو عجیب و غریب مقدمات کا فیصلہ کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان فیصلوں کی اطلاع ہوئی تو آپؐ

نے تبسم فرمایا۔

یمن تازہ تازہ حلقہ بہ گوش اسلام ہوا تھا۔ بعض اخلاقی اور معاشرتی برائیاں باقی تھیں۔ حضرت علیؓ کے سامنے ایک نومولود بچے کے نسب کا قضیہ پیش ہوا۔ تین آدمی اس بچے کے دعوے دار تھے۔ دعوے کی صحت کی تصدیق محال تھی۔ حضرت علیؓ نے حکم دیا کہ اس کی دیت کے تین حصے کیے جائیں' پھر قرعہ ڈالا جائے۔ ایسا ہی کیا گیا۔ جس کے نام قرعہ نکلا انھوں نے بچہ اس کے حوالے کردیا۔

دوسرا ایک مہمل قسم کا مقدمہ پیش ہوا۔

مدعی نے ایک شخص پر الزام عائد کیا کہ اس نے میں نے خواب میں دیکھا کہ اس نے ہمارے اہل خانہ کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ حضرت علیؓ نے مدعی سے فرمایا کہ ملزم کو دھوپ میں لے جاکر کھڑا کردو اور اس کے سائے کو سو کوڑے مارو۔

اس سے زیادہ مناسب فیصلہ اور کیا ہوسکتا تھا؟ خواب میں ارتکاب جرم بے حقیقت تھا۔ اس لیے سزا بھی ایسی ہی تجویز کی گئی جس سے مدعی کو نفسیاتی طور پر تسکین بھی ہوجائے اور اس پر اپنے الزام کی مضحکہ خیز نوعیت بھی واضح ہوجائے۔

محدث ابن عبدالبر نے حضرت علیؓ کے سامنے پیش ہونے والے ایک اور اہم مقدمے کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے۔

دو شخص کھانے پر مل کر بیٹھے۔ ایک کے پاس پانچ روٹیاں اور دوسرے کے پاس تین روٹیاں تھیں۔ اتفاقاً ایک شخص پاس سے گزرا تو ان دونوں نے اس کو بھی کھانے کی دعوت دی۔ کھانے سے فارغ ہوکر اس شخص نے چلتے ہوئے شکر گزاری کے طور پر آٹھ درہم پیش کیے۔ ان کے بٹوارے میں جھگڑا ہوا۔ پانچ روٹیوں والے رفیق نے تین روٹیوں والے رفیق سے کہا کہ پانچ درہم مجھے اور تین درہم تجھے ملنے چاہییں۔ دوسرے کا اصرار تھا کہ رقم مساوی طور پر تقسیم ہونی چاہیے۔

حضرت علیؓ کے سامنے قضیہ پیش ہوا تو انھوں نے پہلے غیر رسمی طور پر تین روٹیوں والے سے کہا کہ تیرا دوست جو کچھ دے رہا ہے لے لے۔ اس نے اصرار کیا کہ عدالتی فیصلہ کیا جائے۔

حضرت علیؓ نے فیصلہ کیا کہ تین روٹیوں والے کو آٹھ درہم میں سے صرف ایک

درہم ملے گا۔ انھوں نے اپنے فیصلے کی وضاحت اس طرح کی کہ آٹھ روٹیوں کو تین اشخاص نے کھایا۔ ان روٹیوں کے مساوی طور پر چوبیس ٹکڑے ہوئے تاکہ آٹھ آٹھ ٹکڑے ہر ایک کے حصے میں آئیں۔ تیرے رفیق کی پانچ روٹیوں کے پندرہ ٹکڑے بنے اور تیری تین روٹیوں کے نو۔ ان نو ٹکڑوں میں سے آٹھ تونے کھائے اور صرف ایک ٹکڑا مہمان کو ملا۔ تیرے رفیق کے پندرہ ٹکڑوں میں سے آٹھ اس نے کھائے اور سات مہمان کو ملے۔ لہٰذا مہمان کے دیئے ہوئے آٹھ درہم میں سے ایک تجھے ملے گا اور سات تیرے رفیق کو ملیں گے۔

ریاضی کے جس فارمولے کے تحت یہ فیصلہ کیا گیا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اس میں حضرت علیؓ کی دقت نگاہ نمایاں ہے۔

حضرت خلیفۂ رابعؓ نے ایک مرتبہ اپنی اسی دقت نگاہ سے خلیفۂ ثانی حضرت فاروقِ اعظمؓ کو ایک حاملہ عورت پر نفاذ حد سے روکا اور انھیں اس امر کی طرف متوجہ کیا کہ سزا درست ہے مگر وقت درست نہیں۔ کیوں کہ اس وقت ایک ایسی معصوم جان بھی متاثر ہوگی جس کا کوئی تعلق اس جرم سے نہیں اور وہ بالکل معصوم ہے۔ اس پر حضرت فاروق اعظمؓ نے حضرت علیؓ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا کہ آج اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہوجاتا۔

حضرت علیؓ کی قانونی باریک بینی کا اندازہ ان دفعات سے بھی ہوتا ہے جو بین الاقوامی اور داخلی دونوں طرح کے قوانین کی وضع و تدوین سے متعلق ہیں۔ ضابطہ ہائے شہادت کی اصلاح بھی انھی کا اہم قانونی اور علمی کارنامہ ہے۔ معاشرے کے استحکام سے ان قوانین کا گہرا تعلق ہے اور ان سے قرآن و سنت میں حضرت علیؓ کی باریک بینی اور ان کی اطلاقی قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت علیؓ کے فتاویٰ بھی ان کے فیصلوں کی طرح علمی بصیرت کے بہترین نمونے ہیں۔ اکثر صحابۂ کبارؓ جن میں حضرت معاویہؓ بھی تھے' لوگوں کو ان کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ میراث کا ایک مسئلہ پوچھنے والے کو حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ اس نے شام سے کوفے کا سفر کیا اور وہاں پہنچ کر معلوم کیا۔

حضرت علیؓ کی زبردست علمی اور اجتہادی شخصیت کے وسیع ترین پہلوؤں میں ان کے وہ خطبات بھی ہیں جو نہج البلاغہ میں ہیں اور جن کا انتساب مسلمہ طور پر ان کی طرف ممکن ہے۔ ان میں سیرت نبویؐ، روح ایمان، انسانی اقدار اور حق و صداقت کے اظہار و ابلاغ کے معجز نما خطبے اور خطوط موجود ہیں۔ انھیں الجاحظ، ابن درید اور المسعودی وغیرہ نے محفوظ رکھا۔

ان خطوط و خطبات نے ہمارے علم و فکر کو ایسی رفعتوں سے ہم کنار کیا جن پر ہمیں فخر کا حق حاصل ہے۔ صحابۂ کرامؓ میں حضرت علیؓ کا شمار ان آئمۂ علم و فضل میں ہوتا ہے جنھوں نے ہماری ثقافت کو اپنے علوم بے پایاں سے ایسی تابندگی بخشی جو قیامت تک باقی رہے گی۔

شہادتِ حسینؓ

اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی کامل اطاعت شہادت حسینؓ کا قابل تقلید پہلو ہے۔ اللہ کی رضا کے لیے سب کچھ قربان کر دینا اور حق کے لیے مصائب برداشت کرنا ہی اصل شہادت ہے۔

شہادتِ حسینؓ کے محرکات

اس مضمون میں اس فکری بحران کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے جو شہادتِ حسینؓ کا باعث بنا' تاکہ اس کے ذریعے سے حضرت حسینؓ کی شہادت کا پس منظر اور اس کے تمام محرکات و مضمرات سامنے آسکیں اور عصری حالات پر ان کے انطباق کی صورتوں پر غور و خوض کیا جاسکے۔

فکری بحران چوں کہ ایک مجرد شے ہے اس لیے انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں اس کے حقیقی مظاہر اقوال و اعمال ہی ہوتے ہیں۔ ان کی بے ربطی ذہن کے انتشار اور فکر کے بحران کو نمایاں کرتی ہے۔

عالم انسانی پر بالعموم اور امت مسلمہ پر بالخصوص وحی و رسالت کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے فکر کو مرکزیت عطا کی' ارتکاز ذہن کے لیے ایک محکم اساس فراہم کی اور نظام زندگی اور اقدار حیات کا تعین اس طرح کردیا کہ ان پر ایمان و یقین رکھنے والے معاشرے میں فکری بحران کا مکمل طور پر سدباب ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد زندگی اور اس کے نظریے سے' معیشت اور سیاست کے اصولوں سے' معاملات اور حقوق انسانی سے اور حریت فرد و جماعت کے تصور سے متعلق کسی بحث و نزاع کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی' کیوں کہ ان سارے امور سے متعلق واضح ہدایات دی جاچکی ہیں۔ یہ ساری ہدایات پوری امت کے لیے کلمۂ جامع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان سے معمولی انحراف اور ان کی من مانی تاویل و تشریح فکری بحران کا موجب ہوسکتی ہے۔ اس لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے بالواسطہ پوری امت کو یہ بھی ہدایت کردی گئی :

ولئن اتبعت اھواء ھم بعد ما جاء ک من العلم ما لک من اللہ من

ولیّ ولا واق (الرعد : ۳۷)

(اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تمھارے پاس آچکا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمھارا حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کی پکڑ سے تم کو بچاسکتا ہے)

اس آیت کے دو نکات خصوصی غور و فکر کا تقاضا کرتے ہیں۔ اول یہ کہ ایک طرف تو وہ وحی الٰہی ہے جسے علم سے تعبیر کرکے اس حقیقت کی طرف اشارہ کردیا گیا کہ زندگی کے تمام حقائق اس میں سمو دیئے گئے اور اب دستور حیات سے متعلق کوئی پہلو ایسا نہیں رہ گیا جو تشنۂ تکمیل ہو۔ عقل کا تقاضا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی امن و سلامتی اور سکون و طمانیت کے لیے علم و برہان ہی کی طرف رجوع کیا جائے کیوں کہ علم ہی ادراک حقیقت اور فکر و نظر کی مرکزیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

دوسرا نکتہ وہ ہے جس میں فکری و عملی بحران و انتشار اور ابتری و پراگندگی کے نقطۂ آغاز کا ذکر کیا گیا ہے، یعنی خواہشات کی پیروی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف علم ہے اور دوسری جانب خواہشات۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اجتماعی زوال، ذہنی انحطاط اور فکری بحران اسی وقت شروع ہوتا ہے کہ جب علم و یقین سے صرف نظر کرکے ذاتی اغراض اور خواہشات کی پیروی کا چلن شروع ہو جائے یا علم اور اس کے تقاضوں پر خواہشات کو فوقیت حاصل ہوجائے۔

علم پر خواہشات کی بالا دستی زندگی کے بنیادی تصور اور اس کے حقیقی نظام سے انحراف کے دروازے کھولتی ہے، مسلمہ اصول و اقدار سے بے اعتنائی پر مائل کرتی ہے اور فکر و عمل کی اس وحدت کو کہ جو علم کی روشنی میں قائم ہوتی ہے، ختم کردیتی ہے۔ اس طرح ہر میلان اور رجحان بے بنیاد نظریے کی صورت اختیار کرلیتا ہے اور معیارِ عدل و حق عملی طور پر بدل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ دستور حیات سے وفاداریوں کے تقاضے پورے نہ کرنے کی وجہ سے معاشرے کا امن و سکون تباہ و برباد ہوجاتا ہے۔ مختلف عقیدے، نظریے، خیالات اور افکار کی یلغار ملّی وحدت کے دامن کو تار تار کر دیتی ہے۔ لوگ گروہوں اور خانوں میں بٹنے لگتے ہیں۔ حقوق پامال ہونے لگتے ہیں اور زندگی پر اصولوں کے بجائے طاقت اور شخصیت کی گرفت مستحکم ہوجاتی ہے۔ چناں چہ

فکر کی لامرکزیت یا فکر کا بحران معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی تباہیوں پر منتج ہوتا ہے۔

حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تاریخ ساز جدوجہد اور حیات بخش شہادت کے محرکات میں جس چیز کو نمایاں اہمیت حاصل تھی وہ فکری بحران اور ذہنی لامرکزیت تھی۔ انھوں نے زوال عدل اور بحران فکر و نظر کے خلاف موثر احتجاج کیا اور نقیبِ حق بن کر ان باتوں کی نشان دہی کی جو انتہائی بنیادی اور اساسی نوعیت کی تھیں۔ مثلاً حرام و حلال کی تمیز کیوں رخصت ہوتی جارہی ہے؟ ہر طرف فتنہ و فساد کا بازار کیوں گرم ہے؟ حدود اللہ کے نفاذ میں کوتاہی کیوں برتی جارہی ہے؟ اللہ تعالیٰ سے عہد شکنی کا رجحان کیوں بڑھ رہا ہے؟ ظلم و ستم نے لوگوں پر عرصۂ حیات کیوں تنگ کر رکھا ہے؟ بیت المال چند لوگوں کے تصرف میں کیوں ہے؟ شورائی جمہوری نظام کی جگہ آمرانہ نظام کیوں مسلط کیا جا رہا ہے؟

حضرت امام حسینؓ کی تنقید و احتساب سے نظام زندگی کے اس شعور و نظریے کی ترجمانی ہوتی ہے کہ جو کتاب و سنت نے مسلمہ اقدار اور مرکز فکر و عمل کے طور پر امت کو عطا کیا اور جس پر اسلام کی تاریخ کا سفر اس وقت تک جاری و ساری رہا۔ اس میں ذاتی اغراض و مفاد پر مبنی سیاست کی کوئی آمیزش نہیں تھی۔ حضرت امام حسینؓ نے اپنی ایک وصیت میں اس بات کی صراحت بھی کردی تھی۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ سرفروشی کس حقیقت کی مظہر تھی؟ یہی نکتہ خاص توجہ کا مستحق ہے۔ دراصل حضرت امام حسینؓ اس بات کا گہرا شعور اور ادراک کامل رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول کریمؐ کے اسوۂ حسنہ سے فرد کے لیے معاشرے میں جس طرز فکر اور طرز عمل کا تعین ہوتا ہے اور جس مقام و مرتبے کا اشارہ ملتا ہے وہ شہادت اور امانت کا طریقہ و مرتبہ ہے۔ ہر فرد اپنے معاشرے میں حق و عدل کے لیے شہادت دینے پر مامور ہے۔ جب صداقت و انصاف کی لو جبر و استبداد کے طوفانوں میں تھرتھرانے لگے، بحران فکر و عمل کی وجہ سے "امانت کا تصور اقتدار سے بدلنے لگے، حقوق و حدود معطل ہونے لگیں اور خواہشات آئین و قانون کی شکل اختیار کرنے لگیں تو منصب نیابت الٰہی پر فائز ہونے والے کا یہ فرض ہے کہ وہ آگے بڑھ کر حقیقتوں کے چہروں سے نقاب الٹ دے اور حق و باطل میں حد فاصل قائم

کردے۔ یہی شہادت ہے جس کا سفر قلب و جاں اور دل و زباں سے شروع ہو کر تسلیم روح و جسم کی منزل پر ختم ہوتا ہے۔

حضرت امام حسینؓ نے اعلائے کلمۂ حق اور اسلامی اقدار حیات کے احیا و نفاذ کا جو سفر شروع کیا وہ اپنے دامن میں تاریخ شہادت کی تاب ناک روایات کے سارے نقوش رکھتا ہے۔ اس سفر میں حق و صداقت کی گواہی زبان و دل کے مرحلے سے بھی گزری اور ترک وطن اور ترک لذات کی صعوبتوں سے بھی۔ یہ گواہی ایثار ذات اور قربانیِ بے بہا کی اس منزل تک پہنچی جہاں شہادت حق صرف اپنے نقد جاں لٹانے ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ اعزہ و اقارب اور معصوم و شیر خوار بچوں کے لہو کی ایک ایک بوند سر مقتل اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا اعلان کرتے ہوئے یہ تاریخ رقم کر گئی کہ جب تک روے زمین پر لا الہ الا اللہ کہنے والے موجود ہیں عدل و حق کے تصورات فکری بحران اور بد عملی کے دھندلکوں میں ہرگز گم نہیں ہوسکتے۔ جبر و استبداد سے حقیقت نہیں بدلی جاسکتی۔ جو لوگ زندگی کا سودا اللہ کے ہاتھوں کر چکے ہوں انھیں تخت و تاج دے کر بھی نہیں خریدا جاسکتا۔ موت ان کے لیے موجب خوف و حزن نہیں بلکہ رضاے الٰہی حاصل کرنے کا وسیلہ اور توسیع حیات کا ایک ذریعہ ہے۔ ایمان و یقین والے جو تصورِ حیات رکھتے ہیں اس میں زندگی صرف اس دنیا تک محدود نہیں' آخرت بھی اس کی منزل ہے۔ اس لیے موت ان کے نزدیک قاطع زندگی نہیں۔ حضرت امام حسینؓ کی شہادت اس نظریے کی نمائندگی اور اسی کاروان یقین کی قیادت کرتی ہے۔ اس شہادت سے اس روایت کو زندگی اور تابندگی ملتی ہے کہ جبر و استبداد' انسانوں پر انسان کی حاکمیت' فکری بحران اور شور و غوغا سے صداے حق کو دبانے کی ہر کوشش کے خلاف ایمان والے اپنے لہو سے نقش لا الہ الا اللہ بناتے رہیں گے اور فکر کو مرکزیت عطا کرتے رہیں گے۔ شہادت حسینؓ محض ایک واقعہ نہیں ہے بلکہ ایک تاریخ اور ایک ابدی روایت بھی ہے۔ یہ قید زمان و مکاں سے آزاد ہے۔ یہ شہادت ایک نظریۂ زندگی سے مثالی وفاداری کا وہ نقش دوام ہے کہ جو مٹ نہیں سکتا۔ ظلم و جور اور فتنہ و فساد کے ہر تاریک ماحول میں اس روایت سے فکر و عمل کی قندیلیں روشن ہوتی رہیں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت امام حسینؓ نے اپنے وقت کے فکری بحران اور مسلم

اقدار زندگی سے انحراف کے ماحول میں شہادت حق کی جو روشن مثال قائم کی وہ ہمارے دامن فکر کو کھینچ کر حال موجود تک لاتی ہے اور ہم سے اپنے موجودہ حالات کے ناقدانہ جائزے کا تقاضا کرتی ہے۔

آج ہمارا معاشرہ ایک بار پھر فکری بحران سے دوچار ہے۔ اسلام کے عطا کردہ دستور حیات سے وفاداریوں کا معیار بدلتا جارہا ہے۔ معاشرت و معیشت اور سیاست کے خدوخال بدلتے جا رہے ہیں۔ عدل و انصاف سے محرومی کا ازالہ نہیں ہو رہا ہے۔ حقوق کی ادائی کار دشوار بنتی جارہی ہے۔ حدود اسلامی کے نفاذ کا مسئلہ تکمیل کے مرحلے تک نہیں پہنچ پا رہا ہے۔ طبقاتی تفاوت بڑھتا جا رہا ہے۔ انسان کے شرف و معیار کا وہ تصور جسے وحی الٰہی نے پیش کیا تھا اپنی عملی صورت پذیری کا ہنوز منتظر ہے۔ اقتدار کی زمام کتاب اللہ کے بجائے انسانی ہاتھوں میں پہنچنے سے اختلاف، انتشار، تصادم اور پیکار کی فضا پیدا ہو رہی ہے۔ وسائل حیات تک عام آدمیوں کی رسائی مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ نظریۂ حیات اور وہ اقدار زندگی کہ جو اسلام نے ہر شعبے کے لیے مسلمہ اصولوں کی صورت میں دی تھیں ان سے انحراف اور روگردانی عام ہوتی جارہی ہے۔ فکر کی مرکزیت میں استحکام باقی نہیں رہا۔ ہم دینی نظام پر تنقید کے لیے اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتے ہیں۔ ملت، قومیت، وطنیت اور انتہا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور عدل و مساوات کا نظریہ بھی اب مسلمہ اقدار کی صورت میں باقی نہیں رہا۔

ایسا ہی وہ ماحول اور فکری بحران تھا جس نے اپنے وقت کے حسینؑ کو تلاش کرلیا تھا۔ آج پھر معیار عدل و حق سے انحراف اور اللہ کے بخشے ہوئے دستور زندگی سے وفاداریوں کا تزلزل ہم سے اسوۂ حسینی پر عمل پیرا ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ ان کا جہاد فکری لامرکزیت کے خلاف تھا۔ ہمیں آج بھی اس فکری بحران کو دور کرنے اور کتابُ اللہ کے سرچشمۂ نظام زندگی ہونے کا شعور عام کرنے کے لیے انھی خار زاروں سے گزرنا ہوگا کہ جن سے حضرت امام حسینؑ گزرے تھے۔ حق کی تمام توانائیوں سے باطل کو مٹانا ہوگا اور فکری بحران سے پیدا ہونے والے ملی انتشار کو وحدت فکر سے دور کرنا ہوگا۔ اس نظام عدل کہ جس میں ہر فرد کے حقوق کی مکمل ضمانت موجود ہے، کے مکمل نفاذ کے لیے فلسفۂ حسینی کو مشعل راہ بنا کر آگے بڑھنا ہوگا۔ یعنی ہمیں پوری جاں سوزی

اور پورے درد دل کے ساتھ ہر فرد ملت کو اصلاح حال کے لیے تیار کرنا ہوگا۔ جبر و استبداد کے خاتمے کی جدوجہد کے لیے ہمیں ہر جوان امروز اور ہر دختر وطن کے دل میں منزل رسن و دار سے گزرنے کا ناقابل تسخیر ولولہ پیدا کرنا ہوگا۔

شہادت حسینؓ کی یہی وہ روشنی ہے جس سے موجودہ فکری بحران کو دور کرنے کا عزم کام یابی سے ہم کنار ہوسکتا ہے۔ یہی وہ درس ہے جو ہمیں ذہنی لامرکزیت کو ختم کرنے اور انتشار و بے یقینی کی صورت حال سے نکلنے کے لیے جدوجہد کرنے کا شہادتِ حسینؓ سے ملتا ہے۔

متاعِ شہادتِ حسینؓ

ہمیں حضرت امام حسینؓ کو یاد اور ان کی عظمت اور رفعت کو سلام کرتے ہوئے اس مقصد کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ جو اتنا بلند اور عظیم و رفیع تھا کہ انھوں نے اسے حاصل کرنے کے لیے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی قربانی ضروری سمجھی۔

اس مقصد اعلا وارفع کی وضاحت متعدد طریقوں سے کی جاسکتی ہے' لیکن واضح ترین انداز یہ ہوگا کہ ہم صاف الفاظ میں یہ کہیں کہ حضرت امام حسینؓ کا مقصد اسلام کے نظام عدل کو اس کی اصل بنیادوں پر قائم کرنا اور رکھنا تھا۔

حضرت امام حسینؓ کی بصیرت اور فراست نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اسلام کے نظام عدل و انصاف میں جو تبدیلی لائی جارہی ہے اگر اس تبدیلی کو روکنے کی کوشش نہ کی گئی تو امت مسلمہ ایک ایسی راہ پر چل پڑے گی کہ جو اسلام کے مزاج کو یکسر بدل کر رکھ دے گی' جب کہ قرآن کریم میں بعثت انبیاؑ کا اہم اور جامع و مانع مقصد قیام عدل قرار دیا گیا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی ہدایات کی روشنی میں ریاست مدینہ میں نظام عدل قرآنی قائم فرمایا تھا۔ خلفاے راشدینؓ نے اسے مستحکم رکھا اور وسیع کیا۔ اس نظام کی بنیاد نیابت الٰہی پر تھی۔ اس کا اساسی تصور یہ عقیدہ تھا کہ حکومت اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور حکومت کا اہل فقط وہی ہوسکتا ہے کہ جو دیانت' اہلیت اور عدل و انصاف کے قیام کے اوصاف اور صلاحیت رکھتا ہو اور اس میں خوف الٰہی موجود ہو۔

اللہ تعالیٰ نے روے زمین پر جس نظام عدل کے قیام کی تاکید فرمائی اس کے تقاضے نیابت اور خلافت ہی کے ذریعے سے پورے ہوسکتے تھے۔ بادشاہی' شخصی اور خاندانی حکومت سے انسانی حقوق پامال ہوتے ہیں اور عدل و انصاف کی بالادستی قائم نہیں

رہتی۔

حضرت امام حسینؓ جب کوفے کے لیے روانہ ہوئے تھے تو مملکت اسلامیہ میں بلاشبہ قرآن و سنت ہی کے قوانین نافذ تھے، لیکن سیاست کا رخ نیابت اور خلافت سے ہٹا کر شخصی اور خاندانی حکومت کی طرف موڑا جارہا تھا۔ یہ اسلام کے اہم اصول سے کھلا ہوا انحراف تھا۔

سوال یہ نہیں تھا کہ اقتدار کن ہاتھوں میں ہو۔ اصل سوال یہ تھا کہ اقتدار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں کس طرح منتقل ہو۔ کیا نظام بادشاہت کی طرح باپ کے بعد بیٹا اقتدار کا وارث قرار پائے یا اسلام کے اصول انتخاب کے مطابق انتقال اقتدار عمل میں آئے؟

حضرت امام حسینؓ نے عیاں طور پر محسوس فرمایا کہ اسلام کے نیابتی نظام کو شخصی اور خاندانی حکومت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ یہ تبدیلی جزوی نوعیت کی نہیں بلکہ بنیادی نوعیت کی تھی۔ اس تبدیلی سے اسلام کے دیے ہوئے نظام زندگی کا ہر شعبہ نہ صرف متاثر ہو رہا تھا، بلکہ اس کی ہیئت اور افادیت ہی ختم ہوگئی تھی۔امانت کا تصور بدل گیا تھا۔ فرمان شاہی کو قانون کا درجہ حاصل ہوگیا تھا۔ عدل کا تصور اب قرآنی ہدایت کے بجائے شخصی احکام کا پابند ہوگیا تھا۔ یہ تبدیلی ریاست کے مزاج، مقصد اور دستور کی تبدیلی تھی اور اسی چیز نے جناب امام حسینؓ کو مضطرب کیا تھا۔

اس نظام بادشاہت میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا تصور صرف زبان تک محدود تھا۔ امرا اور حکام میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے قوانین سے مستثنیٰ سمجھنے کا رجحان پیدا ہوگیا تھا۔ مظلوموں کی داد رسی کے قانونی تقاضے مجروح ہو رہے تھے۔

خلفاے راشدینؓ کے عہد میں ریاست اسلام میں **امر بالمعروف** اور **نہی عن المنکر** کا جو نظام قائم تھا اس کی یہ خصوصیت سب پر عیاں ہے کہ خلیفہ کی ذات پیکرِ تقویٰ و طہارت ہوتی تھی اور معاشرے کے تمام نفوس احکام الٰہی کی پابندی عملاً ضروری سمجھتے تھے۔ اس وصف سے صاحب اقتدار کا بے بہرہ ہونا معاشرے کی اخلاقی اور مذہبی تباہی کا سبب بننے لگا اور عدل کے تقاضوں کا احترام رخصت ہوگیا۔ امر بالمعروف کا نظام معطل ہوگیا۔ آزادانہ انتخاب کا طریقہ ختم کر دیا گیا۔ شورائی نظام بھی

باقی نہیں رہا۔ اظہار رائے کی آزادی سلب ہوگئی۔ خلیفۂ وقت مخلوق اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کی جو ذمے داری محسوس کرتا تھا وہ بادشاہت کے آغاز سے خود بہ خود ختم ہوگئی۔ بیت المال کے بارے میں امانت کا تصور شاہی خزانے کے تصور سے بدل گیا۔

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قانون کی حکومت اور عدل و انصاف کی بالادستی سے محروم ہو کر معاشرہ ایک ایسی راہ پر چل پڑا تھا جو دراصل اسلامی نظام زندگی سے انحراف کی راہ تھی۔

اسلام کی تاکید یہ ہے کہ کسی کو قانون سے بالاتر نہیں ہونا چاہیے' حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ حکم ہوا کہ وہ بتادیں کہ:

ان اتبع الا ما یوحیٰ الیّ (الاحقاف : ۹)

(میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے)

خلفاے راشدینؓ نے بھی اس اصول کی پیروی کی اور بادشاہت سے زیادہ عزت و اقتدار رکھنے کے باوجود وہ قانون الٰہی کے مکمل پابند رہے۔ ان کی دوستی اور رشتے داری قانون کی حد سے نکل کر کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھی۔ اگر کوئی ان کے حق پر دست درازی کرتا تو وہ اپنے اقتدار کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے بلکہ عام آدمی کی طرح عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے عدل و انصاف کی بالا دستی قائم کی۔

حضرت امام حسینؓ نے بادشاہت کے خاتمے کے لیے عظیم الشان قربانی کی راہ اس لیے اختیار کی کہ اس کے بغیر معاشرے پر عدل و انصاف کی بالادستی دوبارہ قائم نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ متاع شہادت امت مسلمہ کے لیے متاع حیات ہے۔

تفضیلاتِ رمضان

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ماہِ رمضان کا ابتدائی عشرہ رحمت، درمیانی عشرہ مغفرت اور آخری عشرہ نارِ جہنم سے نجات کا ہے۔

ماہ رمضان۔ دعوتِ فکر

استقبال ماہ رمضان ہر اہل اسلام کے دل کی آواز ہوتا ہے۔ اہل پاکستان اس ماہِ روحانیت کاملہ کا دل سے استقبال کرتے ہیں اور بلاشبہ پاکستان کا ہر مسلمان اس ماہ کے دوران عبادت میں مصروف اور ریاضت میں مشغول رہتا ہے۔ اس ماہ سعادت اور روحانیت کے لیے کچھ احکام اور ضوابط بھی متعین ہیں جن کا احترام بھی ضروری اور فرض ہے۔ رمضان ایک ایسا مقدس ماہ مبارک ہے کہ اس کی تبریک و تقدس اور بزرگی کو دوام حاصل ہے۔

فیوض و برکات کے اس ماہ صیام کے بارے میں علمائے حق نے ہمیشہ رہنمائی عطا کی ہے اور قرآن حکیم اور حدیث شریف کی روشنی میں راہ عمل تجویز کی ہے۔ روزے کی روحانی افادیت پر امت مسلمہ کا چودہ سو سال کا عمل مسلسل گواہ ہے۔ تربیت فکری و ذہنی کے لیے روزے کے لازوال فوائد ہیں۔ اب تمام دنیا کے علمائے طب و سائنس روزے کی اہمیت و افادیت پر سائنس جدید کی روشنی میں گفت گو کرتے ہیں اور روزے کی افادیت کو علی الاعلان تسلیم کرتے ہیں۔ روزے کے روحانی فوائد مسلم ہیں اور جسمانی فوائد بھی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اسلام دین فطرت ہے۔ جب اس دین میں روزے فرض کیے گئے اور سال کے بارہ مہینوں میں ایک مہینہ روزوں کے لیے مختص کیا گیا تو روزہ لاتعداد منافع اور فوائد کا حامل اور فکر و نظراور جسم و جسد کے لیے ایک بابرکت عمل قرار پایا۔ روحانی عظمتیں اور جسمانی فوائد حاصل کرنے کے لیے اس کی رفعت و افادیت کو تسلیم کیا گیا۔ فیوض و برکات کے پیش نظر روزے انسان پر فرض کیے گئے۔ اس میں انسان کی بھلائی اور اس کی فلاح و بہبود مضمر ہے۔

ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اس مقدس ماہ صیام کا دل و جان سے استقبال کریں، اس

ماہ مبارک کا بھرپور احترام کریں، پابندی کے ساتھ روزے رکھ کر روحانی اور جسمانی فوائد حاصل کریں اور حق تعالیٰ جل شانہ کی اس نعمت کا شکریہ ادا کریں۔

روزے کے افطار و سحر کے اوقات متعین ہیں۔ ان کے احترام کامل کے بغیر روزہ نہیں ہوتا۔ اوقات کی پابندی اس ماہ جلیل کی روح ہے۔ اعتدال اس ماہ عظیم کا درس ہے۔ اس اعتدال پر ہمیں غور کرنا چاہیے۔ ہرچند کہ اس ماہ میں اخراجات بے حساب ہوتے ہیں، بایں ہمہ صرف بے جا کا بھی کوئی مذہبی یا روحانی جواز نہیں ہے۔ اگر اس مہینے میں ہمارے اکل و شرب، یعنی کھانے پینے کے اخراجات معمول سے بہت زیادہ بڑھ جائیں تو یہ صرف بے جا یا حد سے گزر جانے کی تعریف میں آئے گا۔ درحقیقت ماہِ رمضان کی روح تو یہ ہے کہ ہم پورے اعتدال پر قائم رہیں۔ انواع و اقسام کے بہ کثرت کھانے روح رمضان سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ در حقیقت یہ ماہ مقدس ہمیں ایک دعوت فکر دیتا ہے۔ وہ دعوت یہ ہے کہ جب ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میسر نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں تو ہمارا ذہن اور ہمارے دل و دماغ ایک لمحے کے لیے اس حقیقت کے ادراک اور احساس سے خالی نہ ہوں کہ ہزار ہا اور لکھوکھا بندگان خدا ایسے بھی ہیں کہ جن کو نان جویں میسر نہیں ہے اور ان کو دو وقت کی بھی روٹی حاصل نہیں۔ بے شک آپ کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا پورا پورا حق ہے، مگر اس حق کے ساتھ ہی یہ فرض بھی ہے کہ ان لوگوں کا بھی خیال رکھا جائے کہ جن کو آسائش خورد و نوش حاصل نہیں ہے۔ یہ ماہ مقدس انسان کو یہ دعوت فکر و عمل دیتا ہے کہ:

- اس پورے مہینے میں ہم بہ ہر طور اور بہ ہر لحاظ سادگی اختیار کریں۔
- ہماری بھوک اور پیاس اس لیے بھی ہو کہ ہم ان لوگوں کے لیے فکر کریں کہ جن کو روٹی اور پانی میسر نہیں۔
- ہم اپنے کھانے پینے میں بھی سادگی اختیار کریں اور انواع و اقسام کے کھانوں سے بھی گریز کریں۔
- اخلاق و اخلاص کو وطیرۂ زندگی بنائیں اور انسانوں سے محبت کریں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ماہ رمضان کی اس دعوت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ماہِ حریت و روحانیت

ہم اہل اسلام اس ماہ انسانیت کاملہ اور روحانیت اعلا کو ہر سال بڑے جوش و ولولے کے ساتھ خوش آمدید کہتے ہیں اور اس ماہ حریت اور ماہ آزادی حقیقی کا پرجوش استقبال کرتے ہیں۔ ہم رمضان کے ہلال پرنور کو دیکھ کر جو فلک کے پردۂ سیمیں پر جلوہ گر ہوتا ہے دست دعا دراز کرتے ہیں کہ یہ ہلال رمضان المبارک اہل پاکستان، عالمِ اسلام اور تمام امت مسلمہ کے لیے پیغام رحمت لائے اور عالم اسلام کی ہر تاریکی اس کی برکات سے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے نور سے دور ہوجائے۔

لاریب رمضان ساری امت کا مہینہ ہے، روزوں کا اور قرآن کا مہینہ ہے۔ یہ ان عظیم اسرار و برکات کا مہینہ ہے جو ان لوگوں کے قلوب کو اپنے پرتو کا مرکز بناتے ہیں جو رمضان کی حقیقت سے آگاہ ہوتے اور اپنی روحانی بلندی کی وجہ سے منشاے الٰہی کا ادراک کرلیتے ہیں۔

ہر عظمت اور کبریائی کا مالک اللہ واحد ہے۔ اس کی ذات اقدس غیب و شہود پر حاوی ہے اور عالم کون و مکاں پر اسی کی حکمرانی ہے۔ کوئی شے اور کوئی وجود اس کے دائرۂ حکمرانی سے باہر نہیں :

ان الحکم الاّ للّٰہ امر الاّ تعبدوا الاّ ایّاہ (الیوسف : ۴۰)

(فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو)

اللہ رب العالمین کی حکم رانی پر یقین رکھنے والوں کو اللہ کے سوا کسی کی غلامی اور بندگی زیب نہیں دیتی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلانے اور حریت بخشنے کے لیے ہی قرآن حکیم کو اپنے احکام اور ہدایت کے لیے نازل فرمایا۔

ہدایت ربانی اور حریت انسانی کا یہ منشور رمضان کے مہینے میں نازل ہوا۔ اس لیے ماہِ رمضان اہل اسلام کے لیے ماہ حریت بھی ہے۔ اس حریت کا تقاضا یہ ہے کہ اس ماہ کو ہم زیادہ سے زیادہ عبادت و ریاضت اور اس کے فیوض و برکات حاصل کرنے میں گزاریں۔

رمضان کا مہینہ روزوں کا ہے۔ کچھ لوگ اس کو سحر و افطار اور انواع و اقسام کے لذیذ' نشاط انگیز اور پر کیف کھانوں کا مہینہ سمجھتے ہیں' کیوں کہ رمضان کریم ہے اور کرم عبارت ہے سخاوت و کشادہ دستی سے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو کھانے کے لیے زندہ رہتے ہیں۔ اس چشم گنہ گار نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کچھ لوگ اسے کام کی مشقت سے نجات کا مہینہ سمجھتے ہیں اور اس کی مبارک راتوں کو لہو و لعب کی نذر کردیتے ہیں۔ جب دن آتا ہے تو نیند انھیں گھیرے رہتی ہے اور وہ اپنے فرائض میں تساہل کرتے ہیں۔

اس کے برعکس کچھ بندگان الٰہی ایسے ہیں کہ جو نمازیں پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں' مجاہدے کرتے اور نفلیں پڑھتے ہیں۔ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ انھیں جو حکم دیا گیا ہے وہ اس کی بجا آوری کے پابند ہیں۔ وہ اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور اس کی رحمتوں کے امیدوار رہتے ہیں۔ لاریب یہی وہ لوگ ہیں جن کو ان کے روزوں کا اجر اور ان کے عمل و عبادات کا صلہ ملے گا۔ انھیں ان کی ہر نیکی کا دس گنا اجر ملے گا۔ اللہ جس چیز کو چاہتا ہے بڑھاتا ہے۔

ایک اور گروہ بھی ہے کہ جو اللہ کے حکم کے مطابق نمازیں پڑھتا اور روزے رکھتا ہے۔ رات کو نفل بھی پڑھتا ہے' صدقہ و خیرات بھی کرتا ہے اور نیک اعمال میں مسابقت بھی کرتا رہتا ہے۔ بہ ایں ہمہ یہ بندگان الٰہی ظاہری اعمال ہی کو بہت کچھ نہیں سمجھتے۔ ان کی نگاہیں اس ماہ مبارک کے اسرار پر لگی ہوتی ہیں اور وہ انھی سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں۔ ایسے لوگ جس قدر رمضان کی حقیقت کو سمجھتے ہیں دوسروں کے ذہن و فکر کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی۔ انھیں جو فائدہ اپنے اس مجاہدے کا ہوتا ہے وہ دوسروں کو حاصل نہیں ہوتا۔ وہ رمضان کو دلوں کے تزکیے اور باطن کی صفائی کا ایک نادر موقع سمجھتے ہیں۔ اللہ ہمیں اس خوش بختی سے ہم کنار کرے۔

ایسے خوش نصیب لوگ روزے کے فریضے اور اس کے تقاضے کو بہ خوبی سمجھتے

ہیں۔ وہ اپنے جسم کو شہوات سے دور رکھ کر اور آسودگی اور راحت سے بچا کر فکر و ایمان کی پوری توانائیوں کے ساتھ خواہشات نفسانی کے لشکر جرار کو شکست دینے میں کام یاب ہوجاتے ہیں۔ پورے مہینے کی اس مشق کے نتیجے میں روح کو جسم پر اقتدار حاصل ہوجاتا ہے اور انسانیت اس مادیت پر غالب آجاتی ہے جس نے آج کے انسان کو لذتوں کے فریب میں مبتلا کر رکھا ہے، جس نے اس کے دلوں کا نور بجھا دیا ہے اور اسے فکر و نظر سے عاری کردیا ہے۔

رمضان ماہ روحانیت بھی ہے۔ اگر ہم نے اس کی روح اور اس کی روحانیت کو سمجھ لیا اور پورے ماہ روزے رکھ کر بندگی اور پیروی نفس سے نجات حاصل کرلی تو ہماری فکر و نظر میں صفائی آئے گی اور ہمارے ضمیر کا چراغ روشن ہوجائے گا۔ ہم ہر اعتبار سے انسان کامل ہوجائیں گے اور ماہ رمضان ہمارے لیے انسانیت کاملہ کی نوید ہوگا۔

یقین کیجیے کہ عبادت و ریاضت کا حاصل قید شہوات سے رہائی ہے اور آزادی کی بنیاد غیر اللہ سے بے نیازی ہے۔ طاغوت اور غیر اللہ سے یہ بے نیازی مشقت چاہتی ہے، لیکن یہ مشقت لذیذ بھی ہے اور شیریں بھی۔ اس لیے کہ اس کے بعد آزادی کی دولت ملتی ہے اور حریت فکری و سیاسی نصیب ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ حریت زندگی کی متاع گراں مایہ ہے۔

باور کرنا چاہیے کہ اگر اہل پاکستان نے بندگی و پیروی نفس کا جوا اپنے گلے سے اتار پھینکا تو پروانۂ حریت ان کا مقدر ہوگا اور آزادی حقیقی ان کا امتیاز۔ ماہ رمضان کو ہم ماہ حریت اسی لیے کہتے ہیں کہ یہ حقیقی آزادی کی دعوت دیتا ہے اور مادہ پرستی کے آزار سے بچاتا ہے۔

پاکستان میں آج ہمیں آزادی کی متاع گراں مایہ میسر ہے۔ ہمیں اس آزادی اور اس حریت کی قدر کرنی چاہیے اور ایک لمحے کے لیے بھی یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اس حریت کی وجہ سے ہم سربلند اور سرفراز ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہر ماہ حریت میں ہم اپنے قلوب کو ٹٹولا کریں، اپنے فکر و نظر کا بھرپور جائزہ لیا کریں اور پاکستان کی تعمیر کے لیے عزم نو اور جہد مسلسل کا وعدہ کیا کریں۔

عشرۂ رحمت

استقبال رمضان کے ایک خطبے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

انہ قدا ظلکم شہر اولہ رحمۃ و اوسطہ مغفرۃ و آخرہ عتق من النار
(بیہقی)

(تم پر ایک عظیم مہینہ سایہ فگن ہوا ہے۔ اس ماہ مبارک کا ابتدائی حصہ رحمت کا ہے اور درمیانی حصہ مغفرت کا ہے اور آخری حصہ نار جہنم سے نجات کا ہے)

حیات انسانی میں انفرادی پہلو کی دو حالتیں ہیں۔ ایک وہ جس میں جبلی داعیات، طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضے غالب ہوتے ہیں اور دوسری وہ کہ جو اپنی اصل میں روحانی اور ملکوتی ہے۔ اسی وجہ سے زندگی کو مجموعۂ اضداد کہتے ہیں۔ اس خرابی کی اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ زندگی کو نظم و ضبط کا پابند بنایا جائے۔ زندگی کی روش میں یہ تبدیلی جد وجہد کی طالب اور ایک نصب العین کی متقاضی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نظر میں پسندیدہ بننے کے لیے ہمیں رہنمائی درکار ہوتی ہے۔ یہ رہنمائی قرآن مجید سے میسر آتی ہے۔ قرآن مجید کا خود اپنے بارے میں یہ دعوا ہے کہ:

ان ھٰذہ تذکرۃ فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلا (المزمل : ۱۹)

(یہ ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کرلے)

قرآن مجید کے نزول کا آغاز رمضان المبارک میں ہوا۔ زندگی کی اصلاح کے لیے جو کتاب اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی اس کے نزول کی ابتدا رمضان المبارک میں ہوئی۔

چوں کہ ہدایت کا نازل ہونا انسان کے حق میں رحمت ہے اس لیے رمضان المبارک رحمت کے نزول کا مہینہ ہے۔

رمضان قمری سال کا نواں مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہونا شروع ہوا۔ رمضان کے روزے ہر مسلمان پر فرض کیے گئے اور روزے کی اہمیت یہ ہے کہ روزہ پانچ ارکان دین میں سے چوتھا رکن ہے۔ روزہ اس لیے فرض ہے کہ ہم اس کے ذریعے سے اپنے اندر تقویٰ پیدا کریں :

کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون (البقرہ : ۱۸۳)

(تم پر روزے فرض کردیے گئے جس طرح تم سے پہلے انبیاؑ کے پیروکاروں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی)

جن عبادات کی انجام دہی میں ان کی معنویت اور مقصدیت پیش نظر رہے وہ صحیح معنی میں عبادات متصور ہوتی ہیں اور زندگی پر ان کا اثر بھی مرتب ہوتا ہے، لیکن اگر ذریعہ مقصود بن جائے تو پھر مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے دولت کہ جو حصول آسائش کا ذریعہ ہے اور آسائش مقصود ہے۔ جب ایک آدمی کی زندگی میں دولت مقصود بالذات بن جاتی ہے تو وہ اپنے آپ کو ہر آسائش سے محروم کرلیتا ہے۔ اسی طرح روزہ حصول تقویٰ کا ذریعہ ہے اور تقویٰ مقصود ہے۔ اگر کوئی روزے کو مقصود بالذات بنالے تو وہ تقویٰ سے محروم رہے گا۔

انسانی زندگی میں دو طرح کے فضائل لائق تصور ہیں۔ ایک مقصود بالذات فضائل دوسرے وہ فضائل کہ جو کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوسکتے ہیں۔

جب تاریخی تغیرات کے تحت موثرات زندگی بدل جاتے ہیں تو ظاہر بیں لوگ اسے قدروں کے بدلنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ حال آنکہ قدریں نہیں بدلتیں بلکہ قدروں کی نسبت لوگوں کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ جس معاشرے میں مقصود بالذات فضائل کے لیے جگہ نہ رہے اور دوسری قسم کے فضائل عام ہوجائیں اس معاشرے میں اخلاقی زوال کی ابتدا ہوجاتی ہے۔

معاشرے میں یہ تبدیلی اس وقت رونما ہوتی ہے کہ جب زوال سیرت کے نتیجے میں تعلق باللہ کے بجائے رسوم و ظواہر مذہب ہی مقصود اصلی قرار پاجائیں۔ ایسے معاشرے میں موقع پرستی کا کردار ہر کام یابی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جب تک انسان کا ضمیر ایمان باللہ سے دست بردار نہ ہوجائے وہ موقع پرستی کو اپنا شعار نہیں بنا سکتا۔ ایسے زوال پذیر معاشرے میں واعظانہ کردار پیدا ہوجاتا ہے جو یقین باللہ کے بجائے صرف عذاب الٰہی کے خوف سے اصلاح سیرت کی سعی کرتا ہے۔ اس سعی کا بار آور ہونا مشکل ہوتا ہے۔

انفرادی زندگی کی اصلاح صرف اوامر و نواہی کے وعظ اور ان کی خلاف ورزی کے نتیجے میں دوزخ کے عذاب سے ڈرا کر ممکن نہیں ہوتی۔ اصلاح کا ذریعہ صرف اوامر و نواہی کی تکرار نہیں ہوتا۔ جن اسباب نے آخرت کی زندگی میں باز پرس اور جواب دہی کے یقین کو متزلزل کیا ہو' ان کا تدارک ضروری ہوتا ہے۔ یقین کے تزلزل کا سبب عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ قانون شکنی تو عام ہو' مگر اس کی تعزیر کا نظام موجود نہ ہو۔ نیکی پامال ہورہی ہو' بدی پروان چڑھ رہی ہو' ظلم عام ہو اور داد رسی ناممکن ہو تو وعظ و نصیحت اور خوف اصلاح حال میں موثر کردار ادا نہیں کرسکتے۔

جن موثرات زندگی نے انفرادی اور معاشرتی زندگی کو اس حال میں مبتلا کیا ہے' ان میں روزہ اصلاح سیرت اور اصلاح معاشرے کا سبب تب ہی ہوسکتا ہے کہ جب روزہ مقصود بالذات یا رسم ظاہری نہ بن گیا ہو۔ یعنی روزہ رکھنے میں اگر یہ احساس پیدا نہ ہو کہ جو نان جویں کا محتاج ہے اس پر کیا گزرتی ہے' تو اس کے روزہ رکھنے سے اصل مقصد کا حصول محال ہے۔ جس چیز کے نہ ہونے نے اصلاح سیرت کی تدابیر کو بے اثر کیا ہے وہ ہے اخلاق جس کو فرائض و عبادات میں داخل نہیں سمجھا جاتا۔ اخلاق کے بغیر دوسروں کی حالت کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔

آج کی دنیا میں رائج غالب معاشی نظریات کے برعکس قرآن مجید کے نقطۂ نظر سے اخلاق اور معیشت باہم دگر اصولی طور پر مربوط ہیں۔ جیسا کہ اس آیت پاک سے واضح ہوتا ہے:

لن تنالوا البر حتّٰی تنفقوا مما تحبون (آل عمران : ۹۲)

(تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی وہ چیزیں
اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو جنھیں تم عزیز رکھتے ہو)

چناں چہ جب تک اخلاق کو عبادت کا حصہ نہ بنایا جائے گا' زندگی پر عبادت کے متوقع اثرات ہونا ممکن نہیں۔ رمضان کے مہینے میں عبادات کا ثواب دوسرے ایام کی نسبت بہت زیادہ ہوتا ہے' مگر ثواب تو نتیجہ ہے اس بات کا کہ روزے کا اثر روزے دار کی زندگی پر مرتب ہوجائے۔ اگر روزہ رکھ کر وہ متحمل مزاج نہیں بنا تو روزے سے اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوگی۔ اگر روزہ رکھ کر اسے یہ اندازہ نہیں ہوا کہ فقر و فاقے میں مبتلا افراد پر کیا گزرتی ہے تو اس روزے سے اس کی زندگی پر روزے کا اثر مرتب نہ ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس وقت رمضان کی پہلی رات آتی ہے تو شیطان اور سرکش جن قید کردیے جاتے ہیں۔ دوزخ کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں اور جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس مہینے میں بہت سے لوگوں کو دوزخ سے آزاد فرماتا ہے اور اللہ کی طرف سے منادی کرنے والا فرشتہ سارے مہینے روزانہ ہر رات کو یہ اعلان کرتا ہے کہ اے نیکی کے طالب نیکی کی طرف متوجہ ہو اور اے بدی کا ارادہ رکھنے والے برائی سے باز آجا۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ماہ شعبان کے آخری دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور فرمایا : "ایک بڑا مہینہ تم پر سایہ فگن ہے۔ یہ بڑا بابرکت مہینہ ہے۔ یہ ایسا مہینہ ہے کہ اس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔"

رمضان اور قرآن' روزہ اور اخلاق اصلاح سیرت کے عوامل ہیں۔ ان کا باہمی تعلق تقویٰ پر منتج ہوتا ہے۔ اس طرح رمضان اصلاحی عمل کا مہینہ ہے اور اس عظیم اصلاحی عمل کا پہلا عشرہ رحمت ہے۔ اللہ ہمیں اپنی اس رحمت کا حق دار بنائے۔

عشرۂ مغفرت

ماہ رمضان روزوں کا مہینہ ہے۔ فرمان نبوی کے مطابق اس ماہ کا دوسرا عشرہ مغفرت کا ہے۔

یہ ایک خوش خبری اور بشارت ہے کہ ماہ رمضان میں روزے رکھنے سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں اور مغفرت عطا ہوتی ہے۔ انسانی فطرت اضداد کا مجموعہ ہے۔ اس تضاد کی اصلاح اس طرح ہوسکتی ہے کہ انسانی فطرت کو نظم و ضبط اور اطاعت کا پابند بنایا جائے۔

انسانی زندگی کے منضبط اور منظم ہونے میں کوئی کمی اور کوتاہی رہے تو وہ خطا کاری کی جانب مائل ہوجاتی ہے۔ چوں کہ انسانی فطرت میں تضاد ہے اس لیے انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس کی اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی ہر پہلو سے ایک خاص نمونے پر ڈالی جائے۔ جو چیز اسے مغفرت اور معافی کا امیدوار بناتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کی طلب ہے اور فضل اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو بلا استحقاق ملتا ہے۔ انسان کی خطاؤں کے باوجود اس کی مغفرت فضل الٰہی پر منحصر ہے بشرطے کہ اسے اپنی خطاؤں پر ندامت اور ان سے بے زاری ہوگئی ہو۔

روزے انبیاے سابقینؑ کی امتوں پر بھی فرض کیے گئے تھے اور مسلمانوں پر بھی ماہِ رمضان کے روزے فرض کیے گئے۔ روزوں کے فرض کیے جانے کا مقصد زندگی میں تقویٰ پیدا کرنا ہے۔ تقویٰ مقصود ہے اور روزہ اس کا ذریعہ۔ روزہ یہ ہے کہ طلوع سحر سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور دوسری طبعی خواہشات کے پورا کرنے سے رضاے الٰہی کی خاطر خود کو روکے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ جس شخص نے عقیدت و ایمان کے ساتھ ثواب حاصل کرنے کے لیے روزہ رکھا اس کے تمام پچھلے گناہ بخشے جائیں گے۔ جو شخص رمضان میں رات کو اللہ کے آگے کھڑا ہوا یعنی اس نے عبادت کی اور تراویح پڑھی اور شب قدر کو جاگا یا تلاوتِ قرآن پاک کی اس کے تمام گناہ بخش دیے جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کے ہر ایک عمل کا ثواب کئی گنا کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ ثواب سات سو گنا تک پہنچ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ روزے کا ثواب اس سے بھی بالاتر ہے' اس لیے کہ روزہ میرے لیے ہے۔ یعنی بندہ اللہ کی خوش نودی کے لیے روزہ رکھتا ہے اور اللہ ہی اس کی جزا دے گا۔ روزے دار اپنی خواہشات اس کی خوش نودی کی خاطر چھوڑ دیتا ہے اس لیے وہی اس کی جزا دیتا ہے۔ روزے دار کو دو خوشیاں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک خوشی روزہ افطار کرنے کے وقت اور دوسری اپنے پروردگار سے ملاقات کے وقت۔ ہر روزے دار کے منھ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک سے زیادہ پسندیدہ ہوتی ہے۔ دنیا میں شیطان کے شر سے اور آخرت میں دوزخ کی آگ سے بچنے کے لیے روزہ ڈھال ہے۔ جب ہم میں سے کسی کا روزہ ہو تو نہ وہ فحش باتیں کرے اور نہ بے ہودگی اور لڑائی جھگڑا کرے۔ اگر اس کو کوئی شخص برا کہے یا کوئی اس سے جھگڑنے کا ارادہ کرے تو روزے دار کو چاہیے کہ وہ اس سے کہہ دے کہ میں روزے دار ہوں' مجھے کسی کو برا کہنا یا کسی سے لڑنا منع ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رمضان کا مہینہ صبر کا مہینہ ہے۔ صبر کا ثواب بہت ہے۔ یہ مہینہ غم خواری کا مہینہ ہے اور ایسا مہینہ ہے کہ جس میں مومن کا رزق زیادہ کیا جاتا ہے۔ جو شخص اس مہینے میں کسی روزے دار کا روزہ افطار کرائے تو یہ اس شخص کے گناہوں کی مغفرت کا سبب ہوتا ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم نے پوچھا یا رسول اللہؐ ہم سب کے پاس اتنا سامان نہیں ہے کہ اس سے ہم روزے داروں کے روزے افطار کرائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس کو بھی عطا کرتا ہے جو پانی کے ایک گھونٹ یا ایک کھجور سے کسی روزے دار کا روزہ افطار کرائے۔ جو شخص کسی روزے دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلائے اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن حوض کوثر سے ایسا سیراب کرے گا کہ

اسے پھر کبھی پیاس نہ لگے گی یہاں تک کہ وہ جنت میں چلا جائے۔

اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے۔ مہربان اور رحم والا ہے۔ اس کا رحم اس کے قہر پر غالب ہے۔ وہ خطاؤں کو معاف کرنے والا اور مغفرت طلب کرنے والوں کو بخشنے والا ہے۔ جو انسان اپنی کوتاہیوں اور خطاؤں کو خطا سمجھتے ہیں' غلطی کرنے کے بعد اس کا احساس کرلیتے ہیں اور توبہ و استغفار کرلیتے ہیں' اللہ تعالیٰ ان کے گناہ بخش دیتا ہے' لیکن شرط یہ ہے کہ انسان سچے دل سے توبہ کرے اور آئندہ گناہوں سے بچنے کا خلوصِ دل سے عہد کرے۔ روزے انسان کو اللہ تعالیٰ سے قریب کردیتے ہیں اور اس کو موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ گناہوں سے بچے۔ نیکی کی راہ اختیار کرے اور ہر اس چیز سے احتراز کرے کہ جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناپسند اور نا مرغوب ہے۔ ہر وہ فعل کرنے کی کوشش کرے کہ جو اللہ اور اس کے نبیؐ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔

رمضان کا دوسرا عشرہ مغفرت کا عشرہ ہے۔ اس عشرے میں مغفرت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ روزے دار اس عشرے میں اپنے قول سے' اپنے عمل سے' عبادات سے' دعاؤں اور توبہ اور معافی کی طلب کے ذریعے سے اس عشرے کی برکتوں سے مستفید ہوسکتے ہیں۔

ہمارے سفر عمل کا اولین اور پہلا قدم یہ ہے کہ ہم توبہ کریں۔ اپنی طاقتوں اور توانائیوں کے ساتھ اللہ کے آگے جھک جائیں۔ اللہ سے سرکشی اور بغاوت چھوڑ دیں۔ اللہ کے عشق اور محبت میں مست ہوجائیں اور اس کے آگے اس طرح گڑگڑائیں' روئیں اور تڑپیں کہ اللہ کو ہم پر ترس آجائے اور وہ ہمارے گناہوں کو معاف کردے اور ہمیں اپنی نعمتوں سے نواز دے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے :

یاایھاالذین آمنوا امنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا ویکفرعنکم سیاٰتکم و یغفر لکم و اللہ ذوالفضل العظیم
(الانفال : ۲۹)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم خدا ترسی اختیار کروگے تو اللہ تمہارے لیے کسوٹی بہم پہنچادے گا اور تمہاری برائیوں کو تم سے دور

کرے گا اور تمہارے قصور معاف کرے گا۔ اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے)

یہ بشارت ہے مغفرت کی کہ جو انسان اللہ کے آگے جھک کر اور اس کی اطاعت کرکے حاصل کرسکتا ہے۔ چناں چہ رمضان کا دوسرا عشرہ گناہوں سے مغفرت کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اگر ہم رمضان کی اس برکت سے فائدہ اٹھائیں اور اللہ سے ڈرنے والے ہوجائیں تو اللہ ہمیں مغفرت کے امتیاز سے نواز دے گا اور دنیا و آخرت میں سربلندی عطا فرمادے گا۔

عشرۂ نجات

ماہ رمضان کا تیسرا عشرہ عذاب دوزخ سے نجات کا ہے۔ ہر انسان کے لاشعور میں نیکی کی طلب اور بدی سے پرہیز کا رجحان موجود ہے۔ ایک ظالم اور غاصب کہ جو دوسروں کے حقوق کو غصب کرتا ہے اور اس طرح اپنی فطرت کو مسخ کرلیتا ہے' اس کے سوا کوئی انسان ایسا نہیں جو یہ چاہتا ہو کہ نیکی بغیر اجر کے' بدی بغیر مکافات عمل کے اور ظلم بغیر داد رسی کے رہ جائے۔ ظالم اور غاصب فوری نتائج کو بھول جاتا ہے۔ صالح شخص کی تمنا ہوتی ہے کہ آخرت ضرور ہو تاکہ جن اعمال کی باز پرس اور جواب دہی اور جس ظلم کی داد رسی اس زندگی میں نہ ہوسکے' بعد از مرگ زندگی میں ان اعمال کی جزا و سزا ضرور ملے۔

انسان آخر خطا کا پتلا ہے' اس لیے بھی اس کی آرزو ہوتی ہے کہ اس کی خطائیں معاف ہوجائیں اور اس کی زندگی عذاب دوزخ سے محفوظ رہے۔ آخرت کا یقین' یعنی انسان کو اعمال کی باز پرس اور جواب دہی اور جزا و سزا پر یقین ہو تو یہ یقین اسے گناہ کے ارتکاب سے بھی بچاتا ہے اور اگر گناہ سرزد ہوجائے تو اسے توبہ و استغفار سے معافی کی امید بھی ہوتی ہے۔

روزہ جو ایک عبادت ہے' اس کے ذریعے سے انسان کی ایسی تربیت ہوتی ہے کہ وہ نظم و ضبط کا پابند ہوجاتا ہے۔ روزے دار کی زندگی تقویٰ سے معمور ہوجاتی ہے۔ تقویٰ پیدا ہوجائے تو مزاج اور طبیعت میں معصیت کی زندگی سے پرہیز داخل ہوجاتا ہے۔ روزے دار جو طلوع سحر سے لے کر غروب آفتاب تک اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر خود کو کھانے پینے سے روکے رکھتا ہے' روزے کی عبادت کے اثر سے اپنے نفس کو نظم و ضبط کا عادی بنالیتا ہے۔ اس طرح اس کا کردار اتنا اعلا اور مستحکم ہوجاتا ہے کہ وہ

ناجائز اعمال کا ارتکاب کرنے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ وہ وہی اعمال اختیار کرتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔ اخلاقی اعمال پر تو ایمان باللہ کے بغیر بھی عمل ہو سکتا ہے اور نیکی کی خاطر نیکی بھی انجام دی جا سکتی ہے۔ مگر ایمان باللہ کے بغیر غلطیوں کی تلافی اور گناہوں پر طلب مغفرت کی فکر پیدا نہیں ہوتی۔ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے بغیر حق و باطل کی کشمکش میں جان دینے کا ولولہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔

آخرت کے عذاب یعنی دوزخ سے نجات کے لیے اللہ تعالیٰ پر ایمان اور رسالت کا اقرار ضروری ہے۔ اس پر اس معنی میں یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس کی قدرت، حکمرانی اور قانون اس کائنات میں متصرف ہے اور اس کے مقابلے میں باطل کی کوئی حیثیت نہیں۔ اللہ جو انسان اور کائنات کا خالق ہے، وہی انسان کو اس کی ساری غلطیوں اور خطاؤں کے باوجود محض اس کے احساس ندامت پر عذاب آخرت سے محفوظ رکھتا ہے۔

عذاب و ثواب دونوں انسان کے اعمال کے نتائج ہیں۔ اگر ہستی باری تعالیٰ کا یقین نہ ہو اور اچھے عمل پر اجر کی توقع نہ ہو تو ایسی زندگی کا تصور ایک مایوسی کا موقف ہوگا جس سے مستقبل کی بہتری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ انسان کا مذہبی شعور اس بات کا متقاضی ہے کہ ایک ایسی رحم و کرم والی ذات ہونی چاہیے جو گناہوں، غلطیوں اور کوتاہیوں کے اثرات سے بچا سکے اور ان اثرات کے خوف سے نجات دے سکے۔ ایسا یقین پیغمبرانہ تعلیمات ہی کے اتباع سے راسخ ہو سکتا ہے۔ انسان کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اس میں فجور و تقویٰ کا امتیاز اور اللہ کی ربوبیت کا اقرار موجود ہے۔ انسان اپنے نفس کی حالت کے بارے میں ایسی بصیرت رکھتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی طرح دھوکا نہیں دیتا۔ وہ جانتا ہے کہ جو اعمال اس نے کیے ہیں ان سے کوئی دوسرا آگاہ ہو یا نہ ہو، وہ بہ ذات خود اپنے ان اعمال کا ذمے دار ہے اور اسے ان کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ گناہ کا احساس ہی اس کے لیے ایک عذاب کی حیثیت رکھتا ہے اور انسانی احساسات میں یہ طاقت ہے کہ ان کے جسمانی اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر انسان میں انبیاؑ کی تعلیمات کے اس ورثے کے زیر اثر جسے اخلاقی فضائل کے تہذیبی لاشعور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، کسی نہ کسی درجے میں نیکی و بدی کا امتیاز اور اللہ کی ربوبیت کا

اقرار ہر حالت میں موجود ہوتا ہے۔ انبیاؑ کی تعلیم کا مقصد یہ رہا ہے کہ انسان کی یہ صلاحیت نشوونما پائے۔ اس صلاحیت کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ ہے :

وفی الارض اٰیٰت للموقنین ○ وفی انفسکم افلا تبصرون

(الذاریات : ۲۰-۲۱)

(زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لیے اور خود تمھارے اپنے وجود میں ہیں' کیا تم کو سوجھتا نہیں؟)

اسی صلاحیت کو نشو و نما دے کر اور ایک زندہ طاقت بنا کر' اس کے تحت طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں کو منضبط کرنے کی ذمے داری ہر شخص پر عائد ہوتی ہے۔

یہ ذمے داری رمضان کے مہینے اور روزے کی حالت میں بڑی آسانی سے پوری کی جاسکتی ہے بہ شرطے کہ یہ عظیم الشان عبادت پورے شعور کے ساتھ انجام دی جائے۔ روزے کی عبادت اگر اس طرح کی جائے کہ اس کے تمام حقوق ادا کیے جائیں اور ان تمام باتوں سے بچنے کی مسلسل کوشش کی جائے کہ جو ممنوع ہیں تو یہ عبادت نہ صرف انسان کی انسانیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں مدد گار ہوتی ہے بلکہ اس کو اللہ کی اس وسیع مغفرت اور بے پایاں رحم و کرم کا مستحق بھی بنا دیتی ہے کہ جو دنیا اور آخرت کے ہر خوف اور ہر رنج و ملال سے مکمل آزادی دلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے مخلص اور ایمان دار بندوں کے حق میں یہ اعلان کہ :

ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (البقرہ : ۱۱۲)

(اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں)

ایک یقینی بشارت ہے۔ ہر روزے دار کو اس بات پر پورا یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ اس کی یہ عبادت قبول فرمائے گا اور اس کی جانب سے یہ قبولیت اس کے حق میں عذابِ دوزخ سے نجات کا باعث ہوگی۔

اللہ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم ماہ صیام اس طرح گزاریں کہ اس کے سبب ہم اللہ کی رحمت و مغفرت کے حق دار ہوجائیں اور عذاب دوزخ سے نجات کا پروانہ حاصل کرلیں۔

تزکیۂ نفس

رمضان کی برکتیں اور فضیلتیں بے انتہا ہیں۔ یہ قرآن کا اور لیلتہ القدر کا مہینہ ہے۔ عبادت اور تعلق الٰہی کو پائیدار کرنے کا اور اطاعت کا مہینہ ہے۔ اس مہینے میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اپنی نعمتیں اور برکتیں ارزاں فرماتا ہے' لیکن یہ خود بندے پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک ان نعمتوں سے اپنے دامن کو بھرتا ہے۔ اگر کوئی انسان کمی کرتا ہے تو یہ اس کی اپنی کوتاہی اور کم ہمتی ہے ورنہ گلشن میں تنگیٔ داماں کا علاج بھی موجود ہے۔

رمضان میں اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے اور بندہ اپنے رب سے قریب تر ہوتا ہے۔ اس قرب سے بندے کو اپنے جائزے' اعمال کے تجزیے اور اپنے نفس کے تزکیے کا موقع ملتا ہے۔ تزکیہ نفس زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اپنی دنیاوی زندگی میں بھی دانش مند انسان اپنا جائزہ لیتے رہتے ہیں اور اپنے نفس کا تزکیہ کرتے رہتے ہیں۔ تزکیۂ نفس انسان کو غلطیوں سے آگاہ کرتا اور اخلاقی بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے۔ تزکیۂ نفس کی دینی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ سورۂ شمس میں اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنی دیگر مخلوقات کو اپنی ربوبیت پر گواہ کے طور پر بیان کیا ہے اور ان کی قسم کھائی ہے وہاں نفس انسانی کو بھی گواہوں میں شامل فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

ونفس وما سوّاها (الشمس : ۷)

(اور نفس انسانی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کا نفس حقیقت میں ایک صاف شفاف آئینہ ہے' لیکن زندگی کے ان گنت' بے شمار اور مختلف النوع تقاضے اور مسائل اور ان کی تکمیل کی تگ و دو انسان کو ہمہ وقت اس گرد و غبار کے زیر اثر رکھتی ہے جو اس آئینے کو

دھندلا دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی شعوری زندگی کے ہر لمحے میں تین قسم کے حقوق ادا کرتے رہنے کا پابند ہے، حقوق اللہ، حقوق العباد اور حقوق نفس۔

کار دنیا انجام دینے کی اس تگ و دو میں آدمی کو چاہیے کہ ان تینوں قسم کے حقوق کی ادائی میں وہ توازن قائم رکھنے کی کوشش کرے جو اگر قائم ہوجائے تو آئینۂ دل کی صفائی میں فرق نہیں آسکتا۔ یہ فضیلت صرف انبیائے کرامؑ کے حصے میں آئی ہے۔ درحقیقت حقوق اللہ، حقوق العباد اور حقوق نفس کی ادائی میں ہر کوتاہی آئینۂ دل کو زنگ آلود کر دیتی ہے۔ دل کی اس صفائی کا ہر وقت خیال رکھنا اور شعوری یا غیر شعوری کوتاہی کی وجہ سے اس پر آجانے والے داغ دھبوں اور کدورت کو صاف کرتے رہنا ہی تزکیۂ نفس ہے۔ نفس کو کدورتوں سے صاف رکھنے کا یہ عمل اللہ کے نزدیک حصول فلاح کا ضامن ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

قد افلح من زکاھا (الشمس : ۹)

(یقیناً فلاح پاگیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا)

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ اس نے نفس کو نیکی اور برائی میں تمیز اور فرق کرنے کی صلاحیت سے عطا کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

فالھمھا فجورھا و تقوٰھا (الشمس : ۸)

(پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کردی)

اس خداداد صلاحیت کا اثر ہے کہ آدمی جب اللہ یا اس کے بندوں کے حقوق کی ادائی میں کوئی کوتاہی کرتا ہے، کسی پر دانستہ یا نادانستہ کوئی ظلم کر بیٹھتا ہے یا اس سے کوئی ایسا قول یا فعل سرزد ہوجاتا ہے جو اللہ کے کسی بندے کی دل آزاری کا سبب ہو تو اس کے دل پر ایک غبار سا چھا جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہ کی اس تعریف کے ذریعے سے سمجھایا ہے :

الاثم ما حاک فی صدرک (صحیح مسلم)

(جو تمہارے دل میں کھٹکے وہ گناہ ہے)

اس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ سلیم القلب فرد کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا

ہے۔ اسلام کی تعلیمات یعنی قرآن حکیم کی آیات اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ہمیں یہ تعلیم ملتی ہے کہ جو شخص اس طرح اپنے ضمیر کی خاموش آواز کو سن لیتا ہے اور اس گناہ کی تلافی کی کوشش کرتا ہے تو اس کا نفس گناہ کی کثافت سے پاک ہوجاتا ہے۔

دل کے آئینے کو ہر گناہ سے خواہ اس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو خواہ حقوق العباد یا حقوق نفس سے' پاک کرنے کی کوشش تزکیۂ نفس ہے۔

اس ساری گفتگو کا ماحاصل یہ ہے کہ انسان کا نفس شعوری اور غیر شعوری طور پر غلطیوں' کوتاہیوں اور بے احتیاطیوں کی وجہ سے مکدر ہوتا رہتا ہے۔ نفس کی اس خرابی پر متوجہ رہنا اور اس کی صفائی سے غفلت نہ برتنا ہی تزکیۂ نفس ہے۔ یہ عمل اللہ کی نظروں میں اس قدر اہم ہے کہ اسے انبیائے کرامؑ کے فرائض منصبی میں شامل فرمایا گیا ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ان طریقوں کی خصوصی طور پر تعلیم دی جو تزکیۂ نفس کے لیے ضروری ہیں۔ آپؐ کی تعلیمات اور ہدایات پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان جو کوتاہیاں اور غلطیاں حقوق اللہ کے بارے میں کرتا ہے ان کی تلافی اور ان کے برے اثرات کو نفس سے دور کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ آدمی اللہ سے معافی مانگتا رہے۔ اللہ سے معافی مانگنے کا یہ عمل استغفار کہلاتا ہے۔ اس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے : "میں دن میں ستر سے زیادہ بار استغفار کرتا ہوں۔" جہاں تک حقوق العباد کے سلسلے میں ہونے والی غلطیوں' کوتاہیوں اور خطاؤں کا تعلق ہے یہ کام ضرورت اور اہمیت کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ حقوق العباد کو اس وقت تک معاف نہیں فرماتا جب تک متاثر ہونے والے فرد یا افراد سے حساب صاف نہ کرلیا جائے۔"

ایک انسان کے کسی غلط طرز عمل' ناروا سلوک یا کسی زیادتی سے کبھی تو ایک یا چند افراد متاثر ہوتے ہیں اور کبھی ان اثرات کا دائرہ بڑھ کر معاشرے' قوم' ملک اور بعض اوقات ساری انسانیت تک جا پہنچتا ہے۔ اسی مناسبت سے نفس کی کدورت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس تناسب سے تزکیۂ نفس کا عمل مشکل ترین ہوجاتا ہے۔ اس

لیے دوسروں کو اپنے ہاتھ، زبان، قلم، قوت و صلاحیت کے غلط استعمال اور افکار و اعمال کی خرابیوں کے برے اثرات سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ تزکیۂ نفس کا عمل صرف نفس کے آئینے سے اس گرد و غبار کو صاف ہی نہیں کرتا بلکہ آدمی میں اس ضرورت کا احساس بھی پیدا کرتا ہے کہ اسے اپنی آئندہ زندگی میں حتی الامکان کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیے جو دوسروں کی حق تلفی یا ان پر ظلم و زیادتی کا موجب ہو اور اس کے نتیجے میں اس کے اپنے نفس کو بھی داغ دار کردے۔

رمضان کا مہینہ ہمیں تزکیۂ نفس کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ ہم انفرادی اور اجتماعی فیوض سے بہرہ مند ہوں اور دین و دنیا میں سرخ روئی حاصل کرسکیں۔

تقویٰ

زندگی کی یکسانیت میں بعض لمحات بہت فرق پیدا کردیتے ہیں۔ بہت سے کام انسان روزانہ انجام دیتا ہے' لیکن بعض کام خاص وقت یا مخصوص دنوں ہی میں انجام پاتے ہیں اور بڑی خوبی سے انجام پاتے ہیں۔ عبادت کا بھی یہی ہے۔ عبادت کا وقت مقرر ہے۔ نماز کے اوقات کی پابندی سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ روزوں کے لیے ایک خاص مہینہ مقرر ہے۔ رمضان کا مہینہ خاص عبادت اور برکات کا مہینہ ہے۔ اس ماہ مقدس میں قرآن کے نزول کا آغاز ہوا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ہم نے قرآن کو رمضان میں اتارا :

شهر رمضان الذی انزل فیہ القرآن (البقرہ : ۱۸۵)

(رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا)

بلاشبہ رمضان کی فضیلتوں میں ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ اس میں قرآن کی نعمت ہمیں میسر آئی جو ہماری زندگی کا ایک آئین اور ضابطۂ حیات ہے۔

یہ ضابطہ ہمیں اس لیے دیا گیا کہ ہم اس کے مطابق زندگی بسر کریں ۔ قرآن کے مطابق زندگی گزارنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نیک بنیں' اچھے کام کریں اور سچائی اختیار کریں۔ حق پر قائم رہیں' پرہیز گاری' زہد اور تقویٰ کا راستہ اپنائیں۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں وہی انسان سب سے افضل اور سب سے مکرم ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے :

ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم (الحجرات : ۱۳)

(در حقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے)

متقی کون ہے؟ متقی وہ ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ' اللہ کے راستے پر چلنے والا اور

اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی پابندی کرنے والا ہو۔ اپنے ہم جنسوں کے لیے باعث راحت اور اپنے ساتھیوں سے تعاون کا عادی ہو۔ اپنے پڑوسیوں کے لیے باعث مسرت' اپنے خاندان کے لیے ذریعۂ خدمت' اپنے محلے کے لیے وسیلۂ سہولت' اپنے ملک کے لیے فائدہ مند' اپنی قوم کے لیے ترقی کا باعث' اپنے ماں باپ کے لیے سعادت مند اور اپنے چھوٹوں کے لیے پر شفقت ہو۔ غرض اللہ کے بندوں کے لیے اس کا وجود محبت و رافت کا سرچشمہ ہو۔ یعنی جہاں وہ حقوق اللہ کا لحاظ رکھتا ہو وہاں وہ حقوق العباد کا بھی پاس دار ہو۔

قرآن مجید میں تقویٰ ایک جگہ استغنا کے متضاد مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ استغنا کے معنی ہیں بے پروائی اور بے لحاظی۔ اس طرح تقویٰ کا مفہوم خود متعین ہوجاتا ہے اور وہ ہے اللہ کا لحاظ' خیال اور خوف۔ ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

ان اللہ یحب المتّقین (التوبۃ : ۴)

(اللہ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے)

اس قرآنی آیت سے ہم یہ بات خوب سمجھ سکتے ہیں کہ تقویٰ کی کیا اہمیت ہے۔ قرآن کریم کی تفہیم اور اس کتاب ہدایت سے استفادے کی اولین شرط تقویٰ ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر اپنے ایک صحابیؓ سے مخاطب ہوکر اور اپنے قلب مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :

التقویٰ ھا ھنا التقویٰ ھا ھنا (ترمذی و مسلم)

(تقویٰ یہاں ہوتا ہے' تقویٰ یہاں ہوتا ہے)

اس سے ظاہر ہوا کہ تقویٰ نفس کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ جس طرح ہر کیفیت اپنے بعض مظاہر اور علامات کی مدد اور واسطے سے پہچانی جاتی ہے اسی طرح تقویٰ کے بعض مظاہر اور کچھ علامات بھی ہیں۔ اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ یہ علامات کیا ہیں جن سے تقویٰ کی نشان دہی ہوتی ہے تو اللہ کی کتاب ہدایت ہی ہماری رہنمائی اور دست گیری کرتی ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ہے :

ذالک الکتاب لا ریب فیہ ھدی للمتقین ○ الذین یومنون بالغیب و یقیمون الصلوٰۃ و مما رزقنا ھم ینفقون ○ والذین

یومنون بما انزل الیک و ما انزل من قبلک و بالآخرۃ ھم یوقنونO

(البقرہ : ۲ تا ۴)

(یہ اللہ کی کتاب ہے' اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے ان پرہیزگار لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے' اس میں سے خرچ کرتے ہیں' جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں' اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں)

قرآن مجید کی انتہائی جامع آیات میں ان آیات کا شمار ہوتا ہے۔ میں مختصراً یہ بتانے پر اکتفا کروں گا کہ ان آیات قرآنی میں اہل تقویٰ کی کیا صفات بتائی گئی ہیں؟ اہل تقویٰ کی ان صفات پر آپ غور فرمائیے۔ اہل تقویٰ وہ ہیں کہ جو :

- غیب پر ایمان رکھتے ہوں' اللہ کی بتائی ہوئی باتوں کو بلا چون و چرا تسلیم کرتے ہوں۔
- رسول اللہؐ پر اور آپؐ کی تعلیمات پر ایمان رکھتے ہوں اور آپؐ کو برحق مانتے ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور ان تمام حقائق پر جو نظروں سے اوجھل ہیں' ایسا یقین رکھتے ہوں گویا آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔
- پابندی کے ساتھ اور اس طرح نماز ادا کرتے ہوں کہ نماز کے تمام حقوق مناسب طور پر ادا ہوں۔ اس مفہوم کو قرآن نے اقامت صلوٰۃ کی اصطلاح سے ظاہر کیا ہے۔
- اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دے رکھا ہے اسے وہ سب کا سب خود استعمال نہ کرلیتے ہوں اور اسے اپنی ذاتی ملکیت خیال نہ کرتے ہوں بلکہ اس میں سے اللہ کے دوسرے بندوں اور اہل حقوق پر بھی خرچ کرتے ہوں۔ جب اپنے لیے بھی استعمال کرتے ہوں تو اس خیال سے استعمال کرتے ہوں کہ یہ مال اللہ کا ہے اور اللہ ہی کا عطیہ ہے۔ یہ روزی اور مال و دولت ہی پر موقوف نہیں بلکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے علم و ہنر وغیرہ انھیں

عطا فرمایا اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہوں۔

✤ ان کتب اور صحیفوں پر ایمان رکھتے ہوں کہ جو محمد رسول اللہؐ سے پہلے پیغمبروں پر اتارے گئے۔

✤ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہوں۔

ان آیات کریمہ میں قرآن کریم نے تقویٰ اور اہل تقویٰ کا مفہوم بالکل واضح کر دیا ہے۔ اس سے ہم یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر اس چیز سے بچے کہ جو اس کی ذات اور اس کے ہم جنس انسانوں کو' خواہ وہ دور ہوں یا قریب' نقصان پہنچائے اور شریفانہ مقاصد اور ممکن کمالات کی راہ میں حائل ہو۔

تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ تمام گناہوں کو ترک کردیا جائے اور اللہ کی اطاعت کی جائے۔ ان دنیاوی اسباب سے پرہیز کیا جائے کہ جو کائنات کے فطری قوانین کے مطابق کمالات و سعادت دارین کے حاصل کرنے میں حائل ہوں۔

تقویٰ زندگی کے ہر لمحے' ہر مرحلے اور ہر شعبے کے لیے ضروری ہے' لیکن اس کی تربیت کے لیے رمضان المبارک کا مہینہ خاص طور پر موزوں اور مفید ہے۔ قرآن مجید نے رمضان کی مخصوص عبادت یعنی روزوں کا مقصد یہ بتایا ہے :

لعلکم تتقون (البقرہ : ۱۸۳)

(اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کے صفت پیدا ہوگی)

اس یک ماہی تربیت کے نتیجے میں ہم میں یہ بات پیدا ہونی چاہیے کہ ہم اپنے ہر قول و فعل سے قبل یہ سوچنے لگیں کہ یہ اللہ کی مرضی کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس فکر کی وجہ سے ہم ان تمام اقوال و افعال سے پرہیز کرنے لگیں جو اللہ کو ناپسند ہیں۔ یہی تقویٰ کی حقیقت ہے۔

رمضان میں ہر مسلمان اپنے رب سے قریب تر ہوتا ہے اور اس کے احکام کی تعمیل کے لیے اپنے دل و دماغ کو خاص طور پر آمادہ و تیار پاتا ہے۔ رمضان میں مسلمانوں کے معاشرے میں جو ماحول پیدا ہوجاتا ہے وہ تقویٰ کی زندگی گزارنے کے لیے نہایت سازگار ہوتا ہے۔

شبِ قدر

رمضان المبارک کے فضل و شرف کا ایک عظیم ترین پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے دامن میں ایک تاریخ ساز رات کے زریں لمحات ہیں۔ وہ ایسی فضیلت اور برکت والی رات ہے کہ جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے اور اسے نزول قرآن کی رات قرار دیا گیا ہے۔ مفسرین اور محدثین نے اس رات کی فضیلت اور عظمت کے مختلف اسباب بیان کیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مبارک شب کی فضیلت کا ہر پہلو اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے۔ اس رات کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں تقدیروں کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ یہ تقدیریں افراد کی ہوں یا اقوم کی' ان کے فیصلے اسی رات کو ہوتے ہیں۔ ہم بہ الفاظ دیگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس رات کو قوموں کے عروج و زوال اور افراد کے بننے اور بگڑنے کا فیصلہ ہوتا ہے۔

جب اس کرۂ ارض پر حالات یہ تھے کہ انسان' انسان کا محکوم تھا۔ انسان نے انسانی غلامی کے طوق و سلاسل خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی گردن میں ڈال رکھے تھے۔ وہ غلامی کی ذلتوں کے بوجھ تلے دب کر زندگی گزار رہا تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کو کہ جو رحمان اور رحیم ہے اور جو دانا اور حکیم ہے' انسان کی اس حالت زار پر رحم آیا اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ انسان کو استقلال اور حریت کا پروانہ عطا کیا جائے۔ مشیت ایزدی نے اپنے اس ارادے کی تکمیل کے لیے "شب قدر" کا انتخاب کیا۔ اس شب میں انسان اشرف ترین مخلوق قرار پایا اور اسے حریت کی اشرف ترین نعمت عطا ہوئی یعنی قرآن حکیم کا نزول ہوا۔

قرآن مجید کے نزول پر کفار قریش اور عام کفار کا جو ردعمل تھا وہ معلوم ہے۔ قرآن نے توحید کی دعوت دے کر ان کا اقتدار خاک میں ملادیا اور ان کی ہوس رانیوں

کے دروازے بند کرکے ان کی بے مقصد زندگی کو لغو و لاحاصل قرار دے دیا۔ اس مقدس کتاب کی تعلیمات میں جو ہمہ گیری ہے وہ صرف قریش اور اہل مکہ کی قسمت بدلنے کے لیے نہیں بلکہ حق یہ ہے کہ ساری دنیا کی تقدیر بدلنے کے لیے ہے۔

سرور عالم حضور صلی اللہ علیہ و سلم پر اس مبارک رات میں جو کتاب اتاری گئی وہ ایسی تاریخی عظمت والی کتاب ہے کہ آج تک تمام انسانوں کی فلاح و نجات کے لیے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ اس لحاظ سے اس کتاب عظیم کے نزول کی یہ یادگار رات انسان کے حق میں انسانیت ساز اور تاریخ ساز رات ہے کہ اس شب دنیا کی تقدیر بدل گئی۔ انسانی فلاح و کامرانی کا جو کام اس شب قدر میں ہوا وہ تاریخ عالم میں کبھی نہیں ہوا۔ اس لیے یہ رات تاریخ کی تمام راتوں سے افضل رات ہے۔

شب قدر کی فضیلت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق اس رات میں فرشتے اور حضرت جبریلؑ اپنے رب کے حکم سے نازل ہوتے ہیں۔ یہ پوری رات از شام تا سحر سلامتی کی رات ہوتی ہے۔ اس میں کسی شر کا دخل نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس تقدیر ساز رات کے متعلق باقاعدہ متنبہ کردیا گیا کہ تم نادانی سے اسے معمولی رات نہ سمجھ لینا۔ اس شب میں اپنے عمل کا احتساب کرنا' پروردگار عالم کے حضور اپنی مغفرت کی درخواست پیش کرنا اور قرآن مجید کی تعلیمات پر ایمان و اعتقاد کی نئی قوتوں کے ساتھ عمل کے عہد کی تجدید کرنا۔

حدیث میں وارد ہے کہ اسی مبارک رات میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبریلؑ کو قرآن پاک سناتے تھے۔ ترمذی اور ابن ماجہ نے یہ حدیث بھی بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بدنصیب ہے وہ شخص جس نے یہ متبرک رات پائی اور اپنے رب سے اپنے لیے پروانۂ مغفرت حاصل نہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مقدس رات اللہ تعالیٰ کے قلزم رحمت کے تموج کی وہ رات ہے جس کی نظیر پہلے کبھی نہیں ملتی۔ اس رات سے پہلے کتابوں کا نزول ہوا تو ان کی مخاطب ساری دنیا نہیں تھی۔ اس سے پہلے انبیاؑ کی بعثت ہوئی تو ساری دنیا کے لیے نہیں ہوئی۔ پوری انسانی تاریخ میں محض یہ ایک ایسی انوکھی' خوب صورت اور بابرکت رات ہے جب رحمتِ الٰہی نے ہمیشہ کے لیے پوری کائنات کا احاطہ کرلیا اور اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفٰےؐ

صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنا آخری پیغام اس طرح نازل فرمایا کہ وہ عالم گیر اور ہمہ گیر تھا جس سے اس کائنات کی تقدیر سنور گئی اور حق و باطل میں ہمیشہ کے لیے امتیاز قائم ہوگیا۔

کرم یہ ہے کہ اس رات کی مبارک ساعتوں سے ہر سال رمضان میں ہم نوازے جاتے ہیں تاکہ ہم قوموں کی بداعمالی کے انجام سے عبرت حاصل کریں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے لیے بہ جان و دل آمادہ ہوکر اس نعمت بے کراں پر اس کے حضور سجدۂ شکر پیش کریں اور کہیں کہ الٰہی! تو عفو و درگزر کو پسند فرماتا ہے' ہمارے گناہوں سے بھی درگزر فرما۔

تقاضائے شبِ حریت

اگر گلزار حیات پر فکر و نظر کی تمام توانائی منعطف و مرکوز کردی جائے اور اس وصف کے ساتھ دیانت و امانت کی روشنی میں ماضی کا جائزہ لیا جائے تو حاصل مطالعہ یہ ہوگا کہ انسان نے ہمیشہ ہر حال اور ہر دور میں حریت کی حمد و ستائش، اپنی حریت و خودی کے قیام و بقا کے لیے جہد مسلسل اور اپنے شب و روز کی آزادی کے لیے سعی کامل کی ہے۔ اسی جہد مسلسل اور سعی کامل کا نام و عنوان تاریخ ہے۔ اس انسانی تاریخ کے بعض تاریخ ساز شب و روز انسانی تقدیر کے عنوان کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ انھی متبرک ساعتوں میں رمضان کی ستائیسویں تاریخ کی شب بھی ہے جسے دنیا اور حافظۂ عالم کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

یہ صحیح ہے کہ اس ماہ مبارک کی جس تاریخ کا میں نے ذکر کیا ہے اس میں آج سے چودہ سو برس پہلے کوئی ایسا زلزلہ یا طوفان نہیں آیا تھا جس میں انقلاب اور ہنگامہ خیزی کا کوئی مادی تماشا چشم دنیا نے دیکھا ہو، مگر ایک تاریخ ساز انقلاب ضرور آیا تھا کہ جس نے انسانی قسمت کو حیات ارض کے آنے والے ہر دور کے لیے تاب ناک بنا دیا۔ قعرِ ذلت میں گرا ہوا انسان اچانک رفعت افلاک تک پہنچ گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا ہے؟ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ دنیا اور زندگی کا انجام و مآل کیا ہے؟ اسے نہ اپنی حقیقت معلوم تھی اور نہ اسے مقصد زندگی کی خبر تھی۔ اس کی پیشانی صدیوں سے اپنے جیسے انسانوں کے سامنے جھکتی رہی تھی اور وہ اپنے ہی جیسے لوگوں کی حاکمیت کے شکنجوں میں جکڑا ہوا کراہ رہا تھا۔ بہیمانہ زندگی نے اس سے شرف و برتری کا وہ شعور سلب کرلیا تھا کہ جو حضرت آدمؑ نے موروثی طور پر اپنی اولاد کو بخشا تھا۔ انبیائے کرامؑ مبعوث ہوتے رہے اور احکام الٰہی بھی نازل ہوتے رہے، مگر ضلالت و گم راہی کے اندھیرے

ان اجالوں سے الجھتے رہے اور تعلیمات الٰہی کو مسخ کرتے رہے۔ کسی کا ضمیر اگر زندہ تھا تو وہ انسانوں کی پستی دیکھ کر پہاڑوں سے سر ٹکرانا چاہتا تھا۔ یہ ضمیر والے در در کی خاک چھانتے اور صحراؤں میں بھٹکتے پھرتے تھے۔ کہیں کوئی نور اور کہیں کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔ روح انسانی کے اس کرب و اضطراب کی درد ناک داستان ورقہ ابنِ نوفل، عثمان بن الحارث، زید بن عمرو وغیرہ سے پوچھیے۔ سیرت ابن ہشام کے صفحات الٹ کر دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ روح کی تشنگی نے انسانوں کو جاں بہ لب کردیا تھا۔ قلب و نظر کی بیماریوں نے انھیں عالم سکرات میں پہنچادیا تھا۔

آج سے چودہ سو سال پہلے اچانک دریائے رحمت میں تموج پیدا ہوا۔ مخلوق کی نامرادی کامرانی سے بدل گئی اور اسی ماہ مبارک میں، اسی متبرک رات کو اللہ کے مقرب فرشتے جبریلؑ نے غار حرا میں آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا پیغام سنایا :

اقرا باسم ربک الذی خلق (العلق : ۱)

(پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا)

اس مقدس رات کو اللہ کا پورا کلام سمائے دنیا پر نازل ہوگیا، وہ کلام جسے اللہ تبارک و تعالیٰ نے نصیحت و موعظت کا نام دیا اور ان امراض کے لیے شفا فرمایا جو لوگوں کے سینوں میں ہیں۔ قرآن پاک سلامتی اور راہ راست دکھانے والی حق نما کتاب ہے۔ ارشاد باری ہے :

قد جاء کم من اللہ نور و کتاب مبین ○ یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام و یخرجھم من الظلمات الی النور باذنہ و یھدیھم الیٰ صراط مستقیم○ (المائدہ : ۱۵-۱۶)

(تمھارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے اور راہ راست کی طرف ان کی رہ نمائی کرتا ہے)

یہ کتاب اللہ صرف دعاؤں اور مناجاتوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ یہ وہ کتاب ہے جو

زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے اور حکومت کے ایوان سے لے کر فقیر کی جھونپڑی تک زندگی کا کوئی پہلو اس سے باہر اور آزاد نہیں ہے۔ یہ ایک مکمل دستور حیات اور اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا قطعی اور آخری منشور زندگی ہے۔ یہ زندگی کے تجربوں کے مرحلوں سے گزرا ہے۔ یہ صرف خوش نما الفاظ اور معجزانہ طرز بیان کی کتاب نہیں بلکہ یہ وہ کتاب ہے جس نے ہمیں بتایا کہ ہمارا مقام کیا ہے؟ اللہ سے ہمارا رشتہ کیا ہے؟ یقین و ایمان اور وحی و الہام کے بغیر انسانی زندگی کیوں ناکام و نامراد ہوتی ہے؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک مکمل نظام حیات اور ابدی دستور زندگی اسی کتاب سے انسانوں کو حاصل ہوا۔ انسان کا مقام یہ بتایا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نائب ہے اور نیابت درحقیقت ایک امانت ہے۔ اگر نظام مملکت کی امانت کا تحفظ نہیں ہوسکتا تو نیابت کی اہلیت بھی سلب کرلی جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن شریف نے اس کا بار بار اعلان کیا :

الذین ان مکّنّا ھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ
وامروا بالمعروف و نھوا عن المنکر (الحج : ۴۱)

(یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے)

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ زمین پر بسنے اور مکین رہنے کے لیے اقامتِ صلوٰۃ، ادائے زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضروری ہے۔ یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے کہ جب زمین پر اللہ کی حاکمیت اور اس کا اقتدار اعلا قائم کردیا جائے۔ زمین میں عدل و انصاف کا قیام، انسانی حقوق کی بحالی، اصول و قانون کی بالادستی اور امن و امان کی فضا اس وقت پیدا ہوسکتی ہے کہ جب اس مکمل ضابطۂ حیات کو جو پروردگار عالم نے اپنی رحمتوں کی تکمیل کے طور پر ہمیں دیا، ہم دستور زندگی کے طور پر اپنالیں اور تسلیم کرلیں۔ اس مقدس کتاب نے امن عالم کا اعلان ان صاف الفاظ میں کیا کہ کوئی کسی کا حاکم نہیں اور حکومت صرف اور صرف اللہ کی ہے۔

جب حاکم وہی ہے تو پھر ظاہر ہے کہ بندگی بھی اس کے سوا کسی اور کی نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے اس کتاب مقدس نے صاف لفظوں میں اعلان کردیا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی دین قیم ہے، یہی اسلام ہے، یہی راہ امن و سکون ہے اور یہی

تقاضائے فطرت ہے۔ ارشاد باری ہے :

امر الا تعبدوا الا ایاہ ذالک الدین القیم ولٰکن اکثر الناس لا یعلمون (یوسف : ۴۰)

(اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں)

اہل اسلام کو یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ تاریخ انسانی میں آزادی کے حصول اور قیام و بقائے حریت کے لیے سعی پیہم اور جہد مسلسل کی داستانوں کا سراغ تو ہمیشہ ملا' لیکن محکوم کے دیدۂ نمناک میں حقیقی آزادی اور مسرت کے ستارے بہت کم چمکے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ آزادی درحقیقت سیاسی انقلاب یا حکومت کی ہیئت کی تبدیلی سے نہیں حاصل ہوتی' بلکہ نظام قرآن اور حکومت الٰہی کے قیام سے حاصل ہوتی ہے۔ اس راز کا انکشاف اسی کتاب مقدس نے کیا اور یہ اسی کی برکت ہے کہ اس کے نزول کے بعد انسانی حریت کا آفتاب کبھی غروب نہیں ہوا۔ اس روے ارضی پر یہ آواز ہمیشہ گونجتی رہی :

افغیر اللہ ابتغی حکما و هو الذی انزل الیکم الکتاب مفصلا

(الانعام : ۱۱۴)

(تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں' حال آنکہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ تمھاری طرف کتاب نازل کردی ہے)

اذہان و قلوب میں امن و آزادی کی طلب تو ہمیشہ رہی' لیکن یہ راز انسان کو قرآنِ کریم ہی سے معلوم ہوا کہ امن و آزادی اسی وقت ممکن ہے کہ جب اللہ کی حاکمیت مکمل طور پر تسلیم کرلی جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی انسانوں نے اس سے روگردانی کی وہ بندگی اور غلامی کی متعدد زنجیروں میں جکڑے گئے۔

اس روشنی میں ہمیں تاریخ اسلام پر ایک نگاہ عمیق ڈالنی ہوگی اور اہل اسلام کے عروج و زوال کا بہ نگاہ تحقیق جائزہ لینا ہوگا۔ یہی وہ نکتہ ہے کہ جس پر صاحبان فکر و نظر نے ہمیشہ یہ زور دیا کہ ماضی کو یاد رکھنا اور حالات و واقعات ماضی کو محفوظ کرنا لازمی ہے۔

بلاشبہ اہل اسلام عروج و زوال کی راہوں سے گزرتے ہوئے اب اپنی حیات ملی کی ۱۵ویں صدی میں داخل ہوچکے ہیں۔ تقاضائے فکر و نظر اور منشائے وقت تو یہ تھا کہ آج کی دنیائے اسلام من حیث الامہ بڑی سنجیدگی' دیانت و امانت کی عظمتوں اور قلب و ذہن کی پوری گہرائیوں کے ساتھ اپنے چودہ سوسالہ ماضی کے روز و شب کا مکمل جائزہ لیتی۔ پھر ۱۵ویں صدی ہجری کے لیے ایک متوازن لائحۂ عمل تیار کرتی اور خشوع و خضوع کے ساتھ نئی صدی کا آغاز کرتی۔

مگر جس وقت تاریخ کا یہ ورق پلٹا دنیائے اسلام زر' زمین اور زن کی گرفت میں تھی اور اس کی مالی فراوانیوں نے اسے اس درجہ مست کردیا تھا کہ فکر ماضی تو دور کی بات ہے وہ فکر مستقبل سے بھی بے فکر تھی۔ باوجودے کہ فکر و نظر کے لیے دستورِ زندگی اس کے سامنے موجود تھا اور قرآن حکیم کے صفحات اس کے سامنے کھلے ہوئے تھے مگر من حیث المجموع عالم اسلام ان سے غافل تھا اور مال و زر کی فراوانیوں نے اسے راہ اعتدال ہی نہیں راہ حق سے بھی ہٹادیا تھا۔

وہ ضمیر کہ جو اس وقت بیدار ہیں' اس دردناک صورت حال کو سمجھ رہے ہیں اور ہدایت و رشد کا سامان کر رہے ہیں' مگر حالات قابو سے باہر ہیں۔ صاف نظر آرہا ہے کہ عالم اسلام ایک بار پھر زوال کے دور میں داخل ہو رہا ہے اور بڑی تیزی کے ساتھ اپنا وقار کھو رہا ہے۔ طاغوت کی اب کامل گرفت ہوچکی اور اہل اسلام کو بے راہ روی نے اللہ کی محبت سے محروم کردیا۔

اللہ کی حاکمیت سے عالم اسلام نے روگردانی کی اور عین ممکن ہے کہ اب اسے طاغوت کی بندگی اور اسیری کی زنجیروں میں جکڑ کر نمونۂ عبرت بنا دیا جائے۔

اس درد دل کے بعد اب ہم برصغیر کی طرف غور کرتے ہیں :

برصغیر کی تاریخ میں بھی ایک وقت ایسا آگیا تھا کہ جب صدیوں اقبال و عروج کی زندگی بسر کرنے کے بعد ہم ادبار و نکبت کا شکار ہوگئے اور ہم پر انگریزوں کی حکومت مسلط کردی گئی۔ ہم اس استبداد کے خلاف صف آرا ہوئے۔ ہمارے ساتھ ہندستان کی دیگر اقوام بھی جنگ آزادی میں شریک ہوئیں' مگر آپ کو یاد ہوگا کہ ہمارے اور ان قوموں کے مقاصد میں فرق تھا۔ ان کا مقصد صرف غیر ملکی تسلط سے نجات حاصل کرنا

تھا جب کہ ہمارا مقصد تسلط سے نجات کے بعد ایک خاص سرزمین میں اس نظام کا قائم کرنا تھا جو قرآن حکیم کی شکل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ ان قوموں کی منزل صرف جمہوریت تھی۔ مسلمانوں کی منزل اللہ کی حاکمیت اور بنی نوع انسان کی وحدت بھی تھی۔ ملت کے سارے مسلمان اپنی مکمل حرارت ایمانی کے ساتھ اس جہاد میں شریک ہوئے۔ انھوں نے سرفروشانہ جدوجہد کی اور بالآخر غیر ملکی اقتدار کو غیور مسلمانوں کے ایمان و یقین کے سامنے جھکنا پڑا۔

یہ ایک عجیب' حیرت انگیز اور پر معنی اتفاق ہے کہ اللہ کے قانون کے نفاذ کے لیے ہم جس سرزمین کے حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے یعنی پاکستان' وہ بھی ہمیں ٹھیک اسی متبرک شب کو ملی جس میں قرآن مجید کی دولت ملی تھی۔ یہ اہم فیصلۂ الٰہی حکمتوں سے خالی نہیں تھا۔

پاکستان کا حصول قانون الٰہی کے نفاذ کے لیے ہوا۔ اسی لیے اس کے حصول کی تاریخ بھی وہی ہوئی جو قرآن کے نزول کی تاریخ ہے۔

اس تاریخ کی شب صرف روحانی اہمیت ہی نہیں رکھتی بلکہ ہمارے لیے خاص طور پر سیاسی اہمیت بھی رکھتی ہے۔ ہم اس تاریخ کی برکتوں کا مشاہدہ اپنی مادی آنکھوں سے بھی کر چکے۔ ہم نے اپنی دعا کی قبولیت کا اثر دیکھا' ہم نے قوم کی تقدیر کو سنورتے دیکھا اور ہم نے غلامی کی زنجیروں کو کٹ کر بکھرتے دیکھا۔ یہی وہ شب ہے جس کی برکت و تقدیس ہم سے اس کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم اس دن کو یوم استقلال قرار دیں۔ اس لیے کہ قرآن کریم نے اپنے نزول کے بعد ساری دنیا کے انسانوں کے لیے آزادی کا اعلان کیا اور ہمیں نیابت و امانت کا منصب تفویض کیا۔ اس لیے ہمارا فرض یہی نہیں ہے کہ ہم ستائیسویں رمضان المبارک کو یوم استقلال سمجھ لیں اور نزول قرآن کا جشن منا کر مطمئن ہو جائیں۔ ہمیں اپنی راہ و منزل کا جائزہ لینا اور اس پر غور کرنا چاہیے کہ ہم نے اس نیابت اور امانت کا حق کہاں تک ادا کیا؟ کیوں کہ یہ بات کفر و ایمان سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ محض تساہل' تسامح یا غفلت نہیں ہے۔ قرآن کا کہنا ہے :

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکافرون

(المائدۃ: ۴۴)

(اور جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا کہ :

و ان احکم بینھم بما انزل اللہ (المائدہ : ۴۹)

(پس اے نبیؐ، تم اللہ کے نازل کردہ قانون
کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو)

قرآن پاک میں اللہ کے سوا ہر طاقت کو طاغوت کہا گیا ہے اور کفر و ایمان کے فرق کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :

فمن یکفر بالطاغوت و یومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لھا (البقرۃ : ۲۵۶)

(اب جو کوئی طاغوت کا انکار کرکے اللہ پر ایمان لے آیا' اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا' جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں)

ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے عہد کی تکمیل کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادیں۔ ۲۷ رمضان کی مبارک شب' ہماری جدوجہد آزادی کی کام یابی کی تاریخ' ہمارے اس عہد کی تجدید کا بھی مطالبہ کرتی ہے کہ ہم اپنے ملک کو اسلامی مملکت بنانے کے لیے اپنی ساری توانائیاں صرف کردیں اور ہر فرد کتاب الٰہی کے اقتدار کے لیے اپنا اپنا کردار ادا کرے۔ اگر ہم واقعی اسے اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت سمجھتے ہیں تو ہمیں اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے جلد سے جلد وہ معاشرہ قائم کرنا ہوگا جس میں کسی کا استحصال نہ ہو' کسی پر کسی کی بالادستی نہ ہو اور انسان کی گروہوں اور فرقوں میں تقسیم نہ ہو۔ یہی اس کتاب مقدس کا حق ہے۔

تقاضائے حق و انصاف یہ ہے کہ ہم پاکستان میں آج اپنے حالات کا دیانت دارانہ جائزہ لیں۔ اگر ہمارا ضمیر اس کی گواہی دے کہ راہ اسلام میں اٹھنے والے ہمارے قدم میں لرزش ہے' نفاذ شریعت اسلامی میں ہماری فکری و عملی کوتاہیاں حائل ہیں اور ہمارے قلب و نظر حالات حاضرہ کا صحیح جائزہ اور پیش آمدہ مسائل کا صحیح ادراک و احساس نہیں کر رہے تو لازم ہے کہ ہم اپنی کوتاہیوں کو سمجھیں اور اپنے ضمیر کی آواز کو سنیں۔ آوازۂ اسلام اپنے جلو میں شدید و کثیر ذمے داریاں رکھتا ہے۔ اگر ان شدید و

کثیر ذمے داریوں کو پورا کرنے میں ہم نے کوئی فکر و عمل کی کوتاہی اور دیانت و ذہانت کی لغزش کی تو باور کرنا چاہیے کہ اس کی سزا دینے کے لیے قدرت کے ہاتھ نہایت مضبوط ہیں۔

یہ بات آپ سے مخفی نہ ہوگی کہ اس سلسلے میں ہماری انفرادی ذمے داریاں کیا ہیں؟ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب تک ہم امت کے فرد کی حیثیت سے اپنے اخلاق کی اصلاح نہ کریں گے اس وقت تک قرآنی نظام برپا کرنے میں ہمارا کردار موثر نہیں ہوسکتا۔ ہمیں اس حقیقت کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اسلام ایمان اور عمل صالح کے دو اہم ارکان کے مجموعے کا نام ہے۔ عمل صالح صرف عبادات ہی سے نہیں بلکہ معاملات سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ اسلام کا تصور حیات یہ ہے کہ زندگی میں صدق و توحید اساس و بنیاد ہیں۔ فکر میں بھی صدق ہو' قول میں بھی صدق ہو اور معاملات میں بھی صدق ہو۔ یہی بات توحید کے سلسلے میں ہے۔ ایک مسلمان اور ایک موحّد بزدل اور کمزور نہیں ہوتا اور مال و دولت کی محبت میں گرفتار نہیں ہوتا۔

آیئے ہم اپنے آپ کو رذائل اخلاق سے پاک کرکے حسن عمل کے معیار تک پہنچنے کی کوشش کریں تاکہ نظام قرآنی کے قیام کا حق ادا ہوسکے۔

روزہ اور اعتدال

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

یبنی ادم خذوا زینتکم عند کل مسجد و کلوا واشربوا ولا تسرفوا انہ لا یحب المسرفین (الاعراف : ۳۱)

(اے بنی آدم' ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو' اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا)۔

قرآن مجید و فرقان حمید میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو کھانے پینے کی محدود آزادی عطا فرمائی ہے۔ یہ آزادی اس لیے دی گئی ہے کہ کھانا پینا انسان کا فطری تقاضا ہے اور اس فطری احتیاج کو پورا کرنے پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ انسان اگر اس عقل سے کام لے کہ جو اس کو عطا ہوئی اور جس کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کیا گیا تو اس کے لیے یہ معلوم کرلینا زیادہ مشکل نہیں کہ فطری حدود کیا ہیں اور ان کی پابندی کیوں ضروری ہے؟ اگر انسان عقل کا صحیح استعمال کرے اور فکری جدوجہد کو بروئے کار لائے تو قدرت اس درجہ فیاض ہے کہ وہ اپنے نائب کو تکلیف میں نہیں ڈال سکتی۔ لیکن انسان کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں کہ جب وہ اپنے فرائض اور اپنے اوپر عائد ذمے داریوں کی انجام دہی سے غافل ہوجاتا ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے عبادت و ریاضت' جہد للبقا اور مظاہرۂ اخلاق و شرافت کے لیے جو بنیادی فرائض اس پر عائد ہوتے ہیں' ان سے وہ غافل ہوجائے تو زندگی کا سکون' حیات کی طمانیت اور نفس کا اطمینان اس سے چھن جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ زندگی میں محنتیں اور کاوشیں انسان کے لیے سامان تسکین حیات

ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی قیام و بقا کی جدوجہد اور کشاکش کا نام معیشت ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر اس کی زندگی کا ہر گوشہ طرح طرح کی محنتوں اور کاوشوں سے گھرا ہوا ہے اور بہ حیثیت مجموعی انسانی زندگی اضطراری ذمے داریوں کا بوجھ اور مسلسل مشقتوں کی آزمائش ہے۔ قرآن کریم میں ہے :

لقد خلقنا الانسان فی کبد (البلد : ۴)

(درحقیقت ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے)

جو لوگ حرکت میں رہتے ہیں وہ برکت پاتے ہیں۔ جو انسان جدوجہد، سعی مسلسل اور کاوش پیہم کو مشعل راہ بنالیتا ہے، اس دنیا کی فراوانیاں اس کا مقدر ہوجاتی ہیں۔ جب اس کا مقصود اللہ اور اس کی محبت ہوتا ہے تو انسانی عظمت انتہاؤں کو چھولیتی ہے۔ جدوجہد کام یابی کی راہیں کھولتی ہے اور تگ و دو سے رزق کے دروازے کھلتے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ سرزمین پاک بنجر ہے تو یہ غلط ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ہم ہی نے اس راہ میں غفلت کار اور کم ہمتی کو راہ دی ہے اور جدوجہد سے صرف نظر کیا ہے۔ اسی پاکستان میں لکھوکھا ایکڑ زمین آج بھی ہماری توجہ کی محتاج ہے، مگر ہم بعض حالات میں آج بھی باہر کے محتاج بنے ہوئے ہیں اور اپنے اس حال پر غور نہیں کرتے۔

ہم نے زرعی انقلاب کی اپنی پسند کی تعریفیں کی ہیں، مگر درحقیقت زرعی انقلاب کی تعریف صرف یہ ہوسکتی ہے کہ ہم اپنی زمین کا سینہ چیر کر اتنا خوشۂ گندم پیدا کریں کہ جس سے ہماری پرواز میں کوئی کوتاہی نہ آئے۔

میں نے آج قلم اس لیے اٹھایا تھا کہ میں روزہ، رمضان اور صحت کے موضوع پر چند اشارات کروں، مگر بات رزق حلال تک چلی گئی۔ کوئی بات نہیں۔ رمضان کے مقدس و متبرک مہینے کے حوالے سے اگر رزق حلال کا سامان کرلیں تو ہماری تربیت کا سامان مزید ہوجائے گا۔

اب میں قرآن کریم کی ایک آیت کریمہ کی طرف آپ کی توجہ منعطف کراتا ہوں :

فلینظر الانسان الی طعامہ ○ انا صببنا الماء صبا ○ ثم شققنا الارض شقا ○ فانبتنا فیھا حبا ○ وعنبا و قضبا ○ و زیتونا و

نخلا ○ وحدائق غلبا ○ و فاکھۃ و ابا ○ متاعا لّکم
ولانعامکم ○ (عبس : ۲۴ تا ۳۲)

(پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے۔ ہم نے خوب پانی لنڈھایا' پھر زمین کو عجیب طرح پھاڑا' پھر اس کے اندر اگائے غلے اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور طرح طرح کے پھل اور چارے تمھارے لیے اور تمھارے مویشیوں کے لیے سامان زیست کے طور پر)

قرآن مجید کی یہ آیت کریمہ ایک دعوت فکر ہے۔ انسان کتنا ہی غافل ہوجائے اور وہ کتنا ہی اعراض کرے' لیکن دلائل و حقائق اتنے وسیع اور ہمہ گیر ہیں کہ وہ کسی صورت میں بھی اس سے اوجھل نہیں رہ سکتے۔ ایک انسان تمام دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کرلے' لیکن بہ ہرحال اپنی شب و روز کی غذا کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کرسکتا۔ جو غذا سامنے رکھی ہے اسی پر نظرڈالیے۔ یہ کیا ہے؟ گیہوں کا ایک دانہ ہے! اچھا یہ گیہوں کا ایک دانہ اپنی ہتھیلی پر رکھ لیجیے اور اس کی پیدائش سے لے کر اس کی پختگی اور تکمیل تک کے تمام مراحل پر غور کیجیے۔ کیا یہ حقیر سا ایک دانہ وجود میں آسکتا تھا' اگر تمام کارخانۂ ہستی ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اس کی نشو و نما میں سرگرم نہ رہتا؟ اس دانے کو کس نے پیدا کیا؟ کیوں پیدا کیا؟

اچھا اب یہاں سے گریز کرتے ہیں اور شیخ سعدیؒ کے ایک شعر پر غور کرتے ہیں :

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نہ خوری

میری گفتگو میں نکتہ یہ ہے کہ اس خوشۂ گندم کو پیدا کرنے میں کیا کیا عوامل کارفرما ہیں۔ اگر ہم روٹی کا ٹکڑا توڑیں تو ان عوامل کو سامنے رکھیں اور کسی غفلت کا شکار نہ ہوں۔ خاص کر رمضان المبارک میں بھی کسی غفلت کو راہ نہ دیں۔

روزہ ایک عبادت اور فرض ہے۔ اس کے جسمانی اور روحانی فائدے مسلم ہیں۔ میرے نزدیک من جملہ دیگر فیوض و برکات کے' روزے کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ایک انسان کہ جو ہر قسم کی کھانے کی نعمتوں سے بہرہ ور ہے اور ان کے کھانے پینے پر قدرت رکھتا ہے' وہ حسب حکم الٰہی جب کھانے پینے سے ہاتھ کھینچتا ہے' خود کو اکل و

شرب سے روکتا اور کھانے پینے سے احتراز کرتا ہے تو اس وقت اس کو ضرور ان لوگوں کا خیال آنا چاہیے کہ جو اپنی بے بضاعتی کی بنا پر اشیائے خورد و نوش سے مجبوراً محروم رہتے ہیں۔ اس کو اس بھوک کا احساس ہونا چاہیے کہ جو ایک نادار کی قسمت ہوتی ہے۔ اس پیاس کا ادراک ہونا چاہیے کہ جو کشمکش حیات میں ایک تشنہ لب کو برداشت کرنی پڑتی ہے۔

اگر ایک روزے دار کی روح روزے کی اس روح و غایت سے آگاہ اور واقف نہیں ہوتی تو میری رائے میں اس کے احساس و ادراک کی قوتوں کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔

جب آپ روزہ رکھتے ہیں تو خالق کائنات کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ از طلوع سحر تا غروب آفتاب آپ خود پر جو پابندی عائد کرتے ہیں وہ آپ کا اپنا فعل اور آپ کا ضمیر ہے کہ جو آپ کو پابند بناتا ہے۔ آپ پابندی اس لیے کرتے ہیں اور اس پابندی کو توڑتے نہیں، کیوں کہ آپ خوب جانتے ہیں کہ اس کا جاننے والا اور دیکھنے والا صرف اللہ ہے۔ اسی یقین کے ساتھ آپ روزے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اطاعت کی یہ تربیت بھی روزے کا عنوان ہے۔ وہی قادر مطلق جس کے حکم کی آپ تعمیل کرتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں وہی آپ کو کھانے پینے کی پوری آزادی دیتا ہے، مگر اس حد کے ساتھ کہ اسراف نہ کرو۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم اتنا نہ کھائیں کہ وہ ایک طرف اسراف کی تعریف میں آجائے اور دوسری طرف ہمارے جسم اور ہماری روح کے لیے سبب علالت بن جائے۔ ہم جب بھی ضرورت سے زیادہ کھائیں گے ہمارا جسم اور اس کا نظام اسے قبول نہیں کرے گا اور وہ ضائع ہوگا۔

رمضان میں قدرت کی نعمتوں سے بے حساب متمتع ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اپنے اقتصادی نظام کو متاثر کریں اور اپنے لیے اکل و شرب کا زائد از ضرورت و حیثیت سامان کرکے اپنے لیے نئے مسائل پیدا کریں۔ وہ لوگ کہ جو بے حساب نعمتوں سے بے حساب متمتع ہونے کے اہل ہیں، ان کو اپنے پڑوس اور اپنے معاشرے کو اس نظر سے ضرور دیکھنا چاہیے کہ کوئی فاقہ تو نہیں کر رہا ہے۔

میری رائے میں رمضان شریف میں افطار و سحر کے جو اہتمام و انتظامات لوگ

کرتے ہیں وہ اس ماہ مبارک کی روح اور اسپرٹ کے خلاف ہیں۔ کھانے پینے میں تنوعات کثیرہ نقصان دہ ہیں۔ افطار میں عموماً جتنا ہم کھالیتے ہیں' رات کے کھانے سے جو شکم پری کرلیتے ہیں اور پھر صبح سحری میں جو لوازمات ہم کرتے ہیں' وہ کھانے پر کھانے کی تعریف میں آتا ہے اور قطعی طور پر ہماری جسمانی ضرورت و حاجت سے زیادہ ہے۔ ہمیں اس کا احتساب کرنا چاہیے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دنیا میں ہر چیز جتنی زیادہ حقیقت سے قریب ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ سہل' دل نشین اور قابل لحاظ و عمل ہوتی ہے۔ خود فطرت کا یہ حال ہے کہ وہ کسی گوشے میں الجھی ہوئی نہیں ہے۔ الجھاؤ جس قدر پیدا ہوتا ہے بناوٹ اور تکلف سے پیدا ہوتا ہے۔

میں ذاتی طور پر رمضان المبارک میں گزشتہ ۳۸ سال سے افطار کے وقت مروجہ افطاری یعنی دہی بڑے' دال' سموسے' پھلکیاں' چٹنیاں' قلمی بڑے' آلو' کچالو وغیرہ کچھ نہیں کھاتا۔ میرا معمول یہ ہے کہ میں کھجور سے روزہ افطار کرتا ہوں اور اگر ممکن ہوتا ہے تو لیموں یا کسی پھل کا ذرا سا رس پی لیتا ہوں یا کوئی اچھا شربت پی لیتا ہوں۔ نمازِ مغرب سے فارغ ہوکر ناشتہ کرلیتا ہوں' یعنی ایک گلاس دودھ اور ذرا سی ڈبل روٹی وغیرہ بغیر مکھن کے' گاہے انڈا اور بس۔ سحری میں معمولی سادہ کھانا کھاتا ہوں۔ گھی کی روٹی اور چاول رمضان المبارک میں ترک کردیتا ہوں۔ میں اس معمول پر ۳۷۔۳۸ سال سے کاربند ہوں اور مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔

شاید میں غلطی نہیں کروں گا' اگر سب کو ایسا ہی کرنے کا مشورہ دوں۔ یقین کرنا چاہیے کہ ایسا کرنے سے صحت کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس کے برعکس اس میں جسم اور روح دونوں کا فائدہ ہے۔ پھر دیکھیے کہ تراویح اور تہجد میں کیا مزا آتا ہے۔ یہ کیا نماز ہوئی کہ رکوع کر رہے ہیں تو حلق میں پانی اچھل کر آرہا ہے اور سجدے میں غذا جیسے باہر نکلا چاہتی ہو۔

آج جدید سائنس نے یہ ثابت کردیا ہے کہ روزہ کولیسٹرول کو ضائع کرتا ہے۔ یہ وہی خون کا کولیسٹرول ہے کہ جو دل کی بیماریوں کا سب سے بڑا سبب ہے۔ آج کی دنیا میں اس سائنسی انکشاف کے لحاظ سے روزہ ایک برکت ہے۔ جو بات آج سائنس

دانوں کو معلوم ہوئی ہے اس کا ادراک ذات ختم الرسلؐ کو تھا اور ضرور تھا۔ اسی لیے آں حضورؐ نے روزے کو جسم و روح کے لیے باعث خیر و برکت قرار دیا اور مسلمانوں کو اعتدال اور میانہ روی کی تلقین فرمائی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ اس ماہ مبارک کو ہمارے لیے اور عالم اسلام کے لیے باعثِ برکت اور سبب نجات بنائے اور ہم اپنی غلطیوں کی وجہ سے جن عذابوں میں مبتلا ہیں اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہمیں ان سے نجات دلائے۔

روزے کا روحانی و صحّی پہلو

روزے کو عربی میں صوم کہتے ہیں۔ صوم کے لفظی معنی رکنے اور باز رہنے کے ہیں۔ اسلام میں عبادت کی نیت سے اور پابندی اوقات کے ساتھ کھانے پینے اور جنسی خواہشات کی تکمیل سے باز رہنے کو روزہ کہا جاتا ہے۔ طبی اصطلاح میں غذا کو کیفیت یا کمیت کے لحاظ سے محدود کرنے کو روزہ کہہ سکتے ہیں۔

سرور کائنات فخر موجودات آقائے دوجہاں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام کائنات انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے راہ عمل اور حیات انسانی کے ہر پہلو کے لیے رہنمائی عطا فرما دی ہے اور ہر انسانی مسئلے کے لیے قطعی حل تجویز فرما دیا ہے۔ بقائے صحت اور حفظ صحت پر بھی ہمیں جناب رسولؐ سے پوری پوری رہنمائی حاصل ہوتی ہے اور اس رہ نمائی میں سر فہرست روزہ ہے۔ آج کہا جاتا ہے کہ علم طب و صحت اپنی معراج پر ہے اور انسان بہ زعم خود اس کا دعوے دار ہے کہ وہ جسم انسانی کے افعال و اعمال کو خوب سمجھتا ہے۔ انسان یہ کہنے اور طب و سائنس یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ روزہ صحت انسانی کے لیے نہایت ضروری ہے۔

ہمارا ایمان یہ ہے اور یہ ایمان ہرگز متزلزل نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ جسمِ انسانی کے افعال و وظائف کا تمام و کمال علم رکھتا ہے۔ اسی لیے اس نے اپنے رسولؐ اور امت مسلمہ پر روزہ ضروری اور فرض قرار دیا۔ یہ حکم اور فرض صرف حضرت محمدؐ کے دور تک ہی کے لیے نہ تھا بلکہ قیامت تک کے لیے یہ طے پاگیا کہ روزہ صحتِ انسانی کے لیے ضروری ہے۔ چناں چہ طب و سائنس ہمیشہ اس کی تائید کرتی رہی ہیں۔

جسم انسانی کو محض ایک مشین قرار دے دینا صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جسمِ انسانی حیاتیات اور روحانیات کا ایک ایسا مجموعہ اور امتزاج ہے جس کے اصول عمل کو

پرکھنے اور سمجھنے کے لیے مادی وسائل سے ماورا قوا درکار ہیں۔ طبی نقطۂ نظر سے روزہ اس لیے ضروری ہے کہ ترک غذا سے انسان کے جسم میں جمع شدہ اجزائے زائد اور مواد غیر ضروری خرچ ہوجاتے ہیں اور خون اور اعضائے جسم کی ایسی صفائی ہوجاتی ہے کہ وہ نئی توانائیوں کے ساتھ قبول غذا اور افعال معمولہ کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ روزے سے ایک فائدہ یہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ اعضائے شریفہ یعنی معدہ، آنتوں، گردوں وغیرہ کو اور اعضائے رئیسہ یعنی دل و دماغ اور جگر کو آرام مل جاتا ہے اور اس آرام سے ان کی کارکردگی میں بہتری اور اضافہ ہوجاتا ہے۔

یہ عام روزے کی بات ہے، لیکن وہ روزہ جسے جناب رسولؐ نے اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم سے فرض قرار دیا ہے وہ جسمانی بھی ہے اور روحانی بھی۔ اس اسلامی طریقِ روزہ میں انسانی زندگی کے اقتصادی اور معاشی و معاشرتی پہلو بھی پیش نظر ہیں۔ اس میں انسانیت کا تحفظ بھی مدنظر ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ مسلمان جب روزہ رکھے تو اس کی نگاہ فقط جسمانی بہتری ہی پر نہ ہو بلکہ اسے یہ بھی ضرور معلوم ہونا چاہیے اور اس کا بھی ضرور احساس ہونا چاہیے کہ روزۂ اسلامی سے اس کی اقدار روحانی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسلامی روزہ غریبوں کے دکھ درد کو سمجھنا سکھاتا ہے۔ بھوکوں کی بھوک اور پیاسوں کی پیاس کا احساس پیدا کرتا ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ کہ اسلامی روزہ انسان کو انسان سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔

جب صورت حال یہ ہے کہ اسلامی روزہ نہ صرف طبی ہے بلکہ روحانی بھی ہے تو آپ جب روزہ رکھیں تو آپ کو یہ یقین ہونا چاہیے کہ اس سے آپ کی صحت بہتر ہورہی ہے۔ آپ اس کا خیال رکھیں کہ آپ کی غذا معمول سے بڑھ نہ جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے اخراجات معمول سے زیادہ ہوجائیں اور نہ ایسا ہو کہ افطار و سحر پر تکلف دعوتوں کا منظر پیش کرنے لگیں۔ اگر ایسا ہوا تو آپ کو روزے کا کوئی طبی فائدہ حاصل نہ ہوگا اور آپ روزے کے روحانی فوائد سے بھی یکسر محروم رہ جائیں گے، کیوں کہ روزہ تقلیل غذا کا نام ہے۔ روزہ اس کا نام نہیں کہ آپ اپنے کام و دہن کو مرغوب ترین غذاؤں سے آشنا ہونے کا موقع دیں اور اپنے معدے کو ایسی غذاؤں سے بھرلیں جن کو وہ ہضم بھی نہ کرسکے۔ روزے کا مفہوم یہ ہے کہ آپ جب غذا کو ہاتھ

لگائیں تو ان لاتعداد انسانوں کے حال پر غور کریں کہ جو سحر و افطار کے بغیر اللہ و رسولؐ کے حکم پر عمل پیرا ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان ہی کا مرتبہ زیادہ بلند ہے۔

روزے سے ضبط نفس کی عادت پڑتی ہے۔ روزہ جسم کو فضلات سے پاک کرتا ہے۔ خون کو آلودگی سے صاف کرتا ہے اور روزے دار میں حرص اور مرض سے مقابلے کی تاب و طاقت پیدا کرتا ہے۔ اسی لیے نفس کے تزکیے اور جسم کی تربیت کے لیے روزے فرض کیے گئے۔ مسلمان ہر سال پورے ایک مہینے روزے رکھتے ہیں۔ تمام دن نہ کچھ کھاتے ہیں، نہ کچھ پیتے ہیں اور اپنے نفس کو بھی ہر برائی سے روکے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابن آدم کا ہر فعل اس کے اپنے لیے ہے، لیکن روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ روزہ ایک سپر ہے۔ جب کسی کا روزہ ہو تو اس کو چاہیے کہ نہ شہوت کی کوئی بات کرے اور نہ شور و فساد کرے۔ اگر کوئی شخص اس سے گالم گلوچ کرے یا لڑے جھگڑے تو وہ اس سے کہہ دے کہ بھائی میں روزے سے ہوں۔ اس اللہ کی قسم جس کی مٹھی میں محمدؐ کی جان ہے، روزے دار کے منھ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ روزے دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ ایک خوشی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ روزہ کھولتا ہے، دوسری خوشی اس وقت حاصل ہوگی جب وہ اپنے رب سے ملے گا۔

اگر روزے دار سحر و افطار میں احتیاط اور اعتدال برتیں تو روزہ حصول صحت کا ایک طاقت ور اور کارگر ذریعہ ہے اور روحانی و اخلاقی اصلاح کے ساتھ ساتھ اصلاحِ جسم کا بھی اچھا طریقہ ہے۔

روزے کے طبی مضمرات

یوں تو اسلامی عقائد و عبادات کا سارا نظام انسانی جسم و روح کی مکمل صحت کا ضامن ہے' لیکن روزے کا شمار خصوصیت کے ساتھ ان عبادات میں ہوتا ہے جن میں بے شمار صحی اور طبی مضمرات پوشیدہ ہیں۔ روزے کو ہر دور میں جسمانی بیماریوں کو دور کرنے کا وسیلہ اور جسم انسانی کے لیے ایک بہترین مصلح تصور کیا گیا ہے۔ اس لیے اگلی امتوں پر بھی روزے فرض کیے گئے۔ قرآن کریم میں ہے :

یا ایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون (البقرہ : ۱۸۳)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم پر روزے فرض کر دیے گئے' جس طرح تم سے پہلے انبیاؑ کے پیروکاروں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی)

اس حکم سے وہ لوگ ضرور مستثنیٰ ہیں کہ جو کسی مرض یا ضعف کی وجہ سے روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ رکھتے ہوں۔ ان کے ذمے فدیہ ہے۔ بہ ہرحال روزے کا حکم صرف قدیم ہی نہیں بلکہ فطری تقاضوں کے عین مطابق بھی ہے۔

علمائے طب ہر عہد میں بعض مزمن اور مخصوص امراض کا موثر علاج روزے ہی کو تصور کرتے رہے ہیں۔ آج بھی متعدد امراض میں مبتلا مریضوں کو ایک مخصوص مدت تک کھانے پینے سے بچنے کی تاکید سختی کے ساتھ کی جاتی ہے۔

روزے کی صحی افادیت کی طرف نہایت مختصر مگر بلیغ اشارہ سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمایا :

صوموا تصحوا (طبرانی)

(روزے رکھو' تن درست ہوجاؤ گے)

مفہوم یہ ہوا کہ روزہ جسم میں پہلے سے موجود امراض و آلام کا علاج بھی ہے اور حفظ ما تقدم کی ایک تدبیر بھی۔ روزہ رکھنے والا صرف بیماریوں ہی سے نجات نہیں پاتا' بلکہ ان کے لاحق ہونے کے ممکنہ خطرات سے بھی محفوظ ہوجاتا ہے۔ اس کا طبی سبب یہ ہے کہ روزے سے قوت مدافعت بڑھ جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کے امین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد علمائے طب کے لیے چراغ ہدایت بنا اور انھوں نے مریضوں پر اس کے کام یاب تجربات کیے۔ ہم بھی بڑی آسانی سے اس نکتے کو سمجھ سکتے ہیں کہ روزہ تن درستی کا بہترین ذریعہ کیوں ہے۔ اسے امراض جسمانی کے موثر اور شافی علاج کی حیثیت کس طرح حاصل ہے؟

بات یہ ہے کہ ہم سال بھر جو کچھ کھاتے پیتے ہیں اس سے جسم میں مختلف قسم کے فضلات اور فاسد رطوبتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ان سے جو عفونت پیدا ہوتی ہے اس کے سمّی اثرات خون میں شامل ہوجاتے ہیں اور ان سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ جسم میں چربی کا تناسب بڑھ جاتا ہے۔ خون کا دباؤ بڑھنا شروع ہوجاتا ہے۔ عصبی نظام میں خرابی پیدا ہوجاتی ہے۔ شریانوں میں سختی پیدا ہوجاتی ہے۔ قلبی امراض کا حملہ ہونے لگتا ہے۔ وزن بڑھ جاتا ہے اور نقرس وغیرہ بیماریاں بھی پیدا ہونے لگتی ہیں۔

ہم جو کچھ کھاتے پیتے ہیں اس کا اولین واسطہ ہمارے آلات ہضم سے پڑتا ہے۔ یہ آلات مسلسل اکل و شرب سے متاثر ہوتے ہیں۔ بھوک میں کمی آجانا اور طبیعت کا بوجھل رہنا اس بات کی علامت ہے کہ آلات ہضم کو استراحت کی ضرورت ہے اور ان پر ان کی فطری صلاحیت سے زیادہ بوجھ پڑ رہا ہے۔ نیز یہ کہ نشوی اور زلالی موادات معدے' آنتوں' رگوں اور شریانوں میں بھر گئے ہیں۔ جسم سے ان موادات کو نکلنا چاہیے تاکہ جسم میں تازگی اور چستی پیدا ہوسکے۔ روزہ اس مقصد کی تکمیل کرتا ہے۔ آلات ہضم سے دباؤ کو کم کرکے ان کو استراحت کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ان کی کارکردگی کو بڑھا کر فاسد اخلاط کو دور کرتا ہے۔ جسم سے زائد از ضرورت چربی کو نکال کر چستی اور تازگی بخشتا ہے۔ بلند فشار خون اور سمیت کو دور کرتا ہے۔ رگوں اور شریانوں کی امتلائی کیفیت کا ازالہ کرتا ہے۔ نیا' تازہ اور صحت مند خون مہیا کرتا ہے اور چند دنوں

کے روزوں کے عمل سے یہ سارے مقاصد پورے ہوجاتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسانی صحت و عافیت کے پیش نظر ہم پر روزے فرض کیے ہیں۔ اس مدت صیام کو قرآن میں :

ایاما معدودٰت (البقرہ : ۱۸۴)

(چند مقرر دنوں کے روزے ہیں)

کہا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ غذا کی فطری احتیاج تو مسلم ہے، مگر اس سے مکمل اور صحیح استفادے کے لیے نیز تن درست رہنے کے لیے چند دنوں تک اور ایک خاص مدت میں پرہیز بھی ضروری ہے۔

بعض ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اختتام صیام پر جسم کا وزن کم ہوجاتا ہے اور دوران صیام مزاج میں اشتعال اور طبیعت میں اضمحلال عام طور پر دیکھا جاتا ہے۔ پھر اس کو وسیلۂ صحت و شفا کیوں کر قرار دیا جاسکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ روزوں کے باوجود کثرت افطار اور بسیار خوری کا سلسلہ جاری ہے اور یہ مقاصد صوم کے خلاف ہے۔ اگر روزے میں واقعی اختصار غذا سے بھی کام لیا جائے تو یہ شکایتیں کبھی پیدا نہ ہوں۔ رہ گیا وزن کا کم ہونا تو یہ صحت کی علامت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد :

الصوم جنۃ (نسائی)

(روزہ ایک ڈھال ہے)

نہایت وسیع المعنی ہے۔ روزہ گناہوں سے بچنے کے لیے بھی ایک ڈھال ہے اور امراضِ جسمانی سے محفوظ رہنے کے لیے بھی۔

روزہ ۔ روح و جسم کا معالج

ارشاد باری کے مطابق روزے کا اصل مقصد تقویٰ ہے' یعنی جذبات و خواہشات کو قابو میں رکھنا اور غیر معتدل ہیجانات سے اپنے آپ کو بچانا۔ تقویٰ کے لغوی معنی کسی چیز سے بچنے کے ہیں۔ اصطلاح اسلام میں تقویٰ کا مطلب تمام نفسانی خواہشات' جسمانی تقاضوں' شہوانی میلانات اور جذباتی ہیجانات سے اپنی حفاظت کرنا ہے۔ اگر آپ کسی ایسے راستے سے گزرتے ہیں جس کے دونوں جانب جھاڑیاں ہیں تو اپنے کپڑوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ لیتے ہیں تاکہ کپڑے جھاڑیوں میں الجھ نہ جائیں۔ اسی طرح برائیوں اور گناہوں کی جھاڑیوں سے اپنی روح کے دامن کو بچانا چاہیے۔ یہی چیز تقویٰ ہے اور یہی روزوں کی غرض و غایت ہے۔ روزہ ان چیزوں پر پابندیاں عائد کرتا ہے جو خواہشات کو بڑھانے والی ہیں۔ روزے سے انسان کا کھانا' پینا' سونا اور آرام کرنا کم ہوجاتا ہے۔ دوسری دل چسپیوں اور وسائل لذت پر بھی مناسب پابندیاں لگ جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفسانی خواہشات میں کمی ہونے لگتی ہے اور روحانی طاقتیں ترقی پانے لگتی ہیں۔

روزے کا رواج کتنی مدت سے ہے' تاریخ سے اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ نہ جانے کتنی صدیوں سے روزے کو مذہبی حیثیت حاصل ہے۔ ہر مذہب میں روزے کے اصول مقرر ہیں۔ مسلمان' عیسائی' یہودی' ہندو اور بدھ سب اپنی اپنی مذہبی تعلیمات کے مطابق روزے رکھتے ہیں۔

بھوک اور پیاس کی شدت کے عالم میں کھانے اور تشنگی بجھانے پر قادر ہونے کے باوجود جب ایک مسلمان اپنے پروردگار کی خوش نودی کے لیے ان خواہشات کی تسکین نہیں کرتا اور تنہائی میں بھی' جہاں اس کو کوئی کھاتے پیتے نہیں دیکھ سکتا' اپنی بھوک

پیاس کو نہیں مٹاتا تو اس کی روحانی قوتیں اور ضبط نفس کی صلاحیتیں بڑی خوبی کے ساتھ نشو ونما پانے لگتی ہیں۔ اس طرح روزہ انسان کی قوت ارادی، قوت برداشت اور قوت مدافعت کے ارتقا کا باعث بنتا ہے جو اس کی ذاتی شخصیت کی بہتری و ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ سماجی طور پر بھی وہ بہت سے فوائد حاصل کرتا ہے۔ وہ خود کو دوسروں سے قریب پاتا ہے اور اس طرح روزے داروں میں اشتراک و تعاون اور جذباتی ہم آہنگی کی فضا پیدا ہوتی ہے۔

ماہرین طب و سائنس تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ایک صحت مند جسم والے انسان پر روزے کا کوئی نقصان دہ اثر نہیں ہوتا۔ روزہ صحت جسمانی اور علاج الامراض میں مد و مفید اثرات کا حامل ہے۔ قدرتی علاج کے ماہرین نے بھی فاقہ اور روزے کو بڑی اہمیت دی ہے۔ فاقہ ایک فطری اور جبلی چیز ہے۔ اکثر امراض میں انسانوں اور حیوانوں کو غذا کی طرف رغبت نہیں ہوتی اور بعض حالات میں تو غذا کا تصور بھی ناگوار ہوتا ہے۔ فاقہ ایک باقاعدہ علاجی تدبیر ہے۔ علاجی تدبیر کی حیثیت سے فاقے کا ذکر طب کی ابتدائی تاریخ میں بھی ملتا ہے۔ تہذیب جدید کے پیدا کردہ امراض اور تہذیبی عادات و خصائل کی اصلاح کے لیے فاقے سے بہتر کوئی طریقۂ علاج نہیں۔ بہت سی بیماریوں میں لوگوں کو فاقے کی افادیت کا تجربہ ہوا ہوگا۔ میرے تجربے میں بھی بارہا آیا ہے کہ بعض اوقات جب دوسری تدابیر ناکام ہوجاتی ہیں تو فاقے سے کام یابی ہوتی ہے۔

بہت سے امراض بسیار خوری اور پر تکلف غذاؤں کے استعمال کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ خصوصاً خوش حال افراد جو غذا کھاتے ہیں اس میں کم سے کم ۳۵ فی صد غیر ضروری غذا ہوتی ہے۔ کم کھانے پینے سے دماغ اور جسم دونوں کسل اور سستی سے آزاد اور محفوظ رہتے ہیں اور انسان مجموعی طور پر چست و توانا رہتا ہے۔ زائد از ضرورت غذا کو ہضم کرنے میں جو توانائی صرف ہوتی ہے روزے کی صورت میں وہ دوسرے مفید کاموں میں صرف کی جاسکتی ہے۔

بہت سے امراض جسمانی نظام میں مختلف زہروں کے جمع ہوجانے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جسم ہر وقت یہ کوشش کرتا رہتا ہے کہ اس کا صحت مند توازن برقرار

رہے۔ یہ توازن صرف اسی صورت میں بگڑتا ہے جب اس میں غلاظتوں اور گندگیوں کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ جسم جب اس توازن کو واپس لانے کی کوشش کرتا ہے تو خاص امراض کی علامات رونما ہونے لگتی ہیں۔ یہ علامات نزلہ و زکام' بخار' پتی' خارش' پھوڑے پھنسی یا اسہال وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ تمام علامتیں خاص امراض کی عام صورتیں ہیں۔ ان صورتوں میں جسم اپنے زہر اور گندے فضلات کو خارج کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جسم میں زہریلے مواد کا اجتماع بسیار خوری' خاص طور پر غلط قسم کی غذا کی افراط سے ہوتا ہے جیسے گوشت یا گوشت سے تیار کی ہوئی چیزیں' نشاستہ دار غذائیں' تلی ہوئی غذائیں' سفید شکر' شکر اور آٹے یا میدے سے بنی ہوئی مٹھائیاں' چائے اور کافی وغیرہ۔ غذا کی خرابی سے قبض پیدا ہوتا ہے اور زہریلے مواد خارج نہیں ہوتے۔ جو کھانا عام طور پر رائج ہے وہ بھی عموماً ناقص ہوتا ہے ۔ اس میں سے پھوک اور چھلکوں کو عام طور پر خارج کردیا جاتا ہے جس سے غذا میں حیاتین اور معدنی نمکیات کی کمی ہوجاتی ہے۔ اس کا نتیجہ قبض ہوتا ہے۔

زہریلے مواد کو سب سے زیادہ تیزی کے ساتھ ختم کرنے کا ذریعہ فاقہ یا روزہ ہے۔

روزے سے خاص طور پر تین فائدے حاصل ہوتے ہیں :

۱) غذا رک جاتی ہے جس سے زہریلا مواد بننے کا امکان ختم ہوجاتا ہے۔

۲) غذا کے جسم میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے آلات ہضم کو زہروں کے دفع کرنے کی فرصت میسر آجاتی ہے۔

۳) پورے جسمانی نظام (طبیعت) کو اس بات کا موقع مل جاتا ہے کہ اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کرکے زہروں کے اخراج کی طرف متوجہ ہوسکے اور تمام صحت بخش قوتوں کو تحریک دے کر بیماری سے مقابلے کے لیے آمادہ کرسکے۔

یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ غذا کے ہضم کرنے میں بڑی توانائی صرف ہوتی ہے۔ جب غذا کی آمد جسم میں رک جاتی ہے تو یہ توانائی فرصت پاکر جسم کی صفائی اور اصلاح کی طرف رجوع ہوجاتی ہے۔ اگر روزے دار سحر و افطار میں بے احتیاطی اور کھانے پینے میں بے اعتدالی نہ برتیں تو روزہ حصول صحت کا بڑا طاقت ور اور کارگر ہتھیار ہے اور روحانی علاج کے ساتھ ساتھ جسمانی علاج کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

عید یومِ تشکر

فتح و کامرانی اور مسرت کے جشن کو عید سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر قوم نے اپنی اپنی تہذیبی، تاریخی، مذہبی اور تمدنی روایات کی روشنی میں ایک ایسے دن کا تعین کیا ہے جو ان کے لیے اجتماعی قومی مسرت کے دن کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسلام نے بھی مسلمانوں کے لیے قومی و ملی پیمانے پر اظہار مسرت و شادمانی کے لیے دو خاص دنوں کا تعین کیا ہے۔ ایک کا عنوان عیدالفطر ہے اور دوسرے کو عید الاضحیٰ کا نام دیا گیا ہے۔ یوم جشن مسرت کو عید سے تعبیر کرنے کے مختلف اسباب ہیں۔ عود و عنبر اور رنگ و نزہت ہر جشن شادمانی کے لوازم میں شامل ہیں۔ اسی مناسبت سے فرحت و سرور کے دن کا نام عید ہوگیا۔ دوسری توجیہ وہ بھی ہے جو عبدالحق محدث دہلویؒ نے کی ہے۔ وہ یہ کہ ایمان والوں کے دلوں کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کا نزول پیہم اور مسلسل ہوتا رہے اور انعام و مسرت کے دن بار بار آتے رہیں۔ عید لفظ میں اعادے کا مفہوم پنہاں ہے اس لیے اسے عید کہا گیا۔

قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصے کے ضمن میں بھی یہ لفظ آیا ہے :

> ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء تکون لنا عید الاوّلنا و آخرنا (المائدہ : ۱۱۴)

> (ہمارے رب، ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل کر جو ہمارے لیے اور ہمارے اگلوں پچھلوں کے لیے خوشی کا موقع قرار پائے)

اس آیت کریمہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خوشی اور مسرت کے دن کو عید پہلے سے کہا جاتا ہے۔ بہر حال یہ بات اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اسلام نے مسلمانوں

کے لیے فرح و شادمانی کے اس دن کی تعبیر ایک ایسے عمل خیر کے ساتھ کی جو اخلاقی‘ روحانی اور معاشرتی اعتبار سے وسیع تر افادی نتائج کا حامل ہے۔ ماہ صیام کے اختتام پر جو عید آتی ہے اس کو صدقۂ فطر کی عید کہا گیا اور تکمیل حج پر جو عید آتی ہے اسے عیدالاضحیٰ یعنی قربانی کی عید کہا گیا۔ اس سے یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ انعامِ الٰہی پر اظہار تشکر کا نام عید ہے اور اس کی بہترین صورت زکوٰۃ و صدقات اور قربانی ہے جو معاشرے کے محروم افراد کو بھی مسرتوں میں شریک کرکے عید کی خوشی کو حقیقی اور اجتماعی بنادیتی ہے۔

اسلام ہر انفرادی حسن عمل کے اجتماعی مفاد و نتائج کی طرف ہمیں متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ جس نے فطرہ نہیں دیا اس کے روزے آسمان و زمین کے درمیان معلق رہیں گے۔

دوسری حدیث ترمذی کی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے فطرہ نہیں ادا کیا اس سے کہہ دو کہ وہ ہماری عید گاہ کے قریب نہ آئے۔

گویا عید کی مسرتوں میں ان ہی کا حصہ ہے جو دوسروں کے حقوق ادا کرتے ہوں اور اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت پر شاکر رہتے ہوں۔

چوں کہ عید نعمت الٰہی پر اظہار شکر کا دن ہے اس لیے مناسب یہ ہے کہ اسلام کے تصور نعمت کی بھی وضاحت کردی جائے۔ اسلام حیات و کائنات کو اللہ تعالیٰ کی نعمت قرار دیتا ہے‘ لیکن وہ سب سے بڑی نعمت اس سلسلۂ ہدایت کو کہتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام علیہ السلام کی بعثت اور وحی کے ذریعے سے قائم فرمایا۔

ہدایت اور حریت‘ یہ دو نعمتیں ایسی ہیں جن کی تکمیل کے دن کو اجتماعی تشکر اور اجتماعی فرحت و مسرت کا دن قرار دیا گیا۔ گویا خوشی کی بات نہ ملک و اقلیم کی فتح ہے نہ مال و متاع کی کثرت‘ بلکہ خوشی کی بات ہدایت یابی اور شہوات پر قابو پانا ہے۔ اس ہدایت کی سب سے بڑی یادگار ماہ صیام ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام قرآن مجید کی شکل میں آیا۔ وہ وسیع اور عالمی فتح و کام رانی کی رات تھی جس میں اس کتابِ مقدس کا نزول ہوا۔ ہر سال ماہ رمضان کی آمد اس نعمت عظمیٰ کی یاد دلاتی ہے۔

مجدالدین فیروز آبادی نے ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ماہِ

صیام کے اعتکاف میں ہر سال بہ طور تشکر جبریل امینؑ کو قرآن پاک کے نازل شدہ حصے بہ تمام و کمال سناتے تھے۔ تواریخ میں تلاوت کلام پاک کی تاکید اسی سنت کا اتباع ہے۔

دوسری نعمت شہوات پر قابو پانا ہے جو مسلمانوں کو ماہ صیام ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اس مبارک مہینے میں ایک مسلمان مادی قیود کے شکنجوں سے آزاد ہوکر ذکر و فکر سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے اور ہوا و ہوس کی قوتوں کو شکست دے کر روحانی فتح و کامرانی کی منزل سے ہم کنار ہوتا ہے۔ نزول قرآن' لیلتہ القدر کی برکات اور تزکیۂ قلب و نظروہ انعامات ہیں جن پر جشن مسرت کے اہتمام کا حکم دیا گیا۔ مسرت کا یہ دن تشکر کا دن ہے اس لیے مسلمانوں کی یہ عید دنیا کی تمام اقوام کے ایام مسرت سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس میں جو سنجیدگی اور وقار ہے وہ دنیا کی کسی قوم کے تہوار یا عید میں نظر نہیں آتا۔ اسلام کے نزدیک اظہار مسرت رقص و سرود' لہو و لعب' فواحش کے ارتکاب اور مال و دولت کے مسرفانہ مظاہرے کا نام نہیں' بلکہ اللہ کی حمد و تقدیس کا نام ہے۔ خوشی یقیناً انعام الٰہی ہے' مگر اس کا تقاضا بہک جانا یا آپے سے باہر ہوجانا نہیں۔ گمراہ قومیں فرط مسرت میں راہ ہوس اختیار کرتی ہیں اور وفور غم میں اللہ سے بغاوت کرتی ہیں۔ مسلمان کو غم اور خوشی دونوں حالتوں میں اس رشتے کو یاد رکھنے کی تاکید کی گئی ہے جو اس کے اور خالق کے درمیان ہے۔ اسلام یہ سکھاتا ہے کہ جب خوشی کا موقع آئے تو سب سے پہلے انسان کی زبان پر کلمات حمد جاری ہوں۔ عید بھی خوشی اور مسرت کا ایک ایسا ہی اہم موقع ہے جس میں اللہ کا شکر ادا کرنا اور اس کی حمد کرنا واجب ہے۔ اسی لیے اس دن پانچ وقت کی نمازوں میں ایک اور وقت کی نماز کا اضافہ کردیا گیا اور یہ بتایا گیا کہ اسلام میں مسرتوں کا کس طرح اہتمام کیا جانا چاہیے اور خوشی کے کیا تقاضے ہونے چاہئیں۔

اس طرح کی مالی و جسمانی عبادات' اخلاقی و روحانی پاکیزگی' نیز انعام الٰہی پر تشکر کا نام عید ہے۔ ایسی عید اللہ تعالیٰ سارے مسلمانوں کو نصیب فرمائے!

دانائے سبل

سیرت نبویؐ کے چند بصیرت افروز پہلو

حکیم محمد سعید

آج سارا عالم اسلام کرب و پریشانی میں مبتلا ہے۔ ایک طرف تو ہم اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں اور دوسری طرف اسلام دشمن طاقتیں اپنی تمام قوتوں کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہی ایک ایسا روشن راستہ ہے جو ان حالات میں ہمیں منزل سے ہم کنار کرسکتا ہے۔

جناب محترم حکیم محمد سعید صاحب وقت کے تقاضوں کو محسوس کرکے ریڈیو سے اور سیرت کے اجتماعات میں ختم رسل' دانائے سبل' رحمتہ للعالمین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے مختلف پہلوؤں کو پورے خلوص' محنت اور لگن سے پیش کرتے رہے ہیں۔ ان ۴۸ مضامین کو کتابی صورت میں "دانائے سبل" کے نام سے پیش کردیا گیا ہے۔ ان سے یہ ترغیب ملتی ہے کہ ہادی برحقؐ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرکے فرد اور معاشرہ دونوں دین و دنیا میں کام یابی اور کام رانی حاصل کرسکتے ہیں۔

یہ مجلد کتاب نہایت خوب صورتی سے چھاپی گئی ہے۔

صفحات : ۱۹۲ قیمت : ستر روپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس' ناظم آباد' کراچی ۷۴۶۰۰



ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی